اعلان داخلہ

قرآن کالج لاہور

"یک سالہ رجوع الی القرآن کورس" میں داخلے شروع ہیں

تعلیم یافتہ حضرات کے لئے علم قرآن سیکھنے کا نادر موقع

نصاب : عربی، منتخب نصاب قرآن، تجوید، تحریکی لٹریچر، اصول فقہ
اصول حدیث و مطالعہ حدیث

کم سے کم تعلیمی قابلیت : بی اے

فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ : 27 ستمبر97ء

انٹرویوز : 29 ستمبر97ء۔ صبح 00 : 9 بجے کالج کیمپس میں

آغاز کلاس : یکم اکتوبر97ء۔ ہاسٹل کی سہولت موجود ہے

بی اے (دوسالہ کورس) میں داخلے شروع ہیں

پنجاب یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی، تجوید، ترجمہ و تفسیر قرآن
اور کمپیوٹر کی لازمی تدریس، سنجیدہ ماحول اور بامقصد تعلیم

فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ : 20 ستمبر97ء

انٹرویوز : 22 ستمبر۔ صبح 00 : 9 بجے کالج کیمپس میں

آغاز کلاس : 24 ستمبر97ء۔ ہاسٹل کی سہولت موجود ہے

رابطہ وپراسپکٹس : 191۔ اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

وَمَن یُؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً

(البقرہ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۶ — جمادی الاولیٰ ۱۴۱۸ھ — ستمبر ۱۹۹۷ء — شمارہ ۹

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۹۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

قرآن کالج میں بحمد اللہ ایف اے سال اول اور آئی کام پارٹ ون میں داخلے گزشتہ ماہ کے دوران مکمل ہو چکے ہیں اور نئے تعلیمی سال کا باقاعدہ آغاز ہو گیا ہے۔ اس سال ایف اے میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد 42 اور آئی کام میں داخلہ لینے والوں کی کل تعداد 28 ہے۔ آج سے قریباً نو سال قبل وقت کی ایک اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے وسائل اور تجربے کی کمی کے باوصف قرآن کالج کے منصوبے کا آغاز کیا گیا تھا اور اب اللہ کا شکر ہے کہ یہ ادارہ بہت حد تک مستحکم ہو چکا ہے۔ تعلیمی و تدریسی امور کے ساتھ ساتھ دفتری اور انتظامی امور بھی بڑی باقاعدگی، پابندی اور حسن و خوبی کے ساتھ سرانجام پا رہے ہیں۔

یہ کالج دراصل دینی اور دنیوی علوم کے امتزاج کی ایک ایسی کوشش کا مظہر ہے، جس کی خواہش ملک و ملت کا درد رکھنے اور احیاء اسلام کی آرزو رکھنے والے تمام اکابر ملت کے دلوں میں مچلتی رہی۔ تعلیم کے میدان میں ہمارے ہاں جو ثنویت قائم ہے سب جانتے ہیں کہ وہ ہمارے قومی استحکام اور ترقی کے راستے کی ایک اہم رکاوٹ ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے بالعموم دینی علوم سے نابلد ہوتے ہیں اور دینی مدارس سے کسب علم کرنے والے عموماً دنیاوی علوم سے قطعی بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے ملک میں تعلیم کی صورتحال کسی بھی اعتبار سے قابل رشک نہیں ہے۔ ملکی آبادی میں پڑھے لکھے افراد کا تناسب تشویشناک حد تک کم ہے، پھر ہمارے تعلیمی اداروں میں معیار تعلیم کی جو کیفیت ہے وہ بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تاہم اس وقت اس سنگین صورتحال کے اسباب پر گفتگو ہمارے پیش نظر نہیں ہے، صرف اس جانب توجہ دلانا مقصود ہے کہ اس تناظر میں قرآن کالج کا وجود بسا غنیمت ہی نہیں امید کی ایک روشن کرن بھی قرار دیا جا سکتا ہے، جہاں نہ صرف یہ کہ کالج کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابتدائی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان کی تدریس اور قرآن حکیم کے لفظی ترجمے کے علاوہ اس کے منتخب مقامات کی تشریح و توضیح کا اہتمام بھی ہوتا ہے بلکہ کلاسوں کے انعقاد میں بھی باقاعدگی اور پابندی پائی جاتی ہے۔ گویا طلبہ کو بھرپور موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ ایک پرسکون ماحول میں پوری یکسوئی اور لگن کے ساتھ حصول تعلیم کر سکیں اور ایف اے اور بی اے کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم اور اس کے مفہوم و معارف کے ساتھ ایک ذہنی رشتہ استوار کر سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے قارئین اور احباب اس تعلیمی کام کی اہمیت کو محسوس کریں اور قرآن کالج کے وجود کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی اولاد کے لئے یہ طے کر لیں کہ انہیں اسی کالج سے تعلیم دلوائیں گے۔

درس ۸

ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات
سورۃ التغابن کی روشنی میں

(۳)

ایمان کے عملی تقاضے

اب ہم اللہ کے نام سے سورۃ التغابن کی آخری تین آیات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں یہ تاثر اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ "ایمان اور اس کے ثمرات و مقتضیات" کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سورت کے مضامین کی ترتیب اس اعتبار سے بڑی حسین ہے کہ اس کے پہلے رکوع میں ایمان کے تینوں اجزاء (ایمان باللہ 'ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی نہایت جامع وضاحت اور ان پر ایمان لانے اور انہیں حرزِ جان بنانے کی زوردار دعوت ہے۔

دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پانچ آیات کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ ان میں ایمان کے ثمرات اور مضمرات کا نہایت جامع بیان ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ اس کے بعد تین آیات جن پر یہ سورۂ مبارکہ مکمل ہوتی ہے ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں' جنہیں تین اہم اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی (۱) تقویٰ (۲) سمع وطاعت اور (۳) انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کو قرض حسنہ دینا۔ آخر میں مضمون کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی چند صفات کمال اور اسمائے حسنیٰ کا بیان ہے۔ تو آیئے کہ پہلے ان آیات کا رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَاَطِيْعُوا وَاَنْفِقُوا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (آیات ۱۶-۱۸)

"پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان میں ہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو' یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی ہوں گے جو آخری منزل مراد کو پہنچ سکیں گے۔ اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا' اور اللہ قدر دان بھی ہے اور نہایت علم والا بھی۔ وہ کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے' زبردست' صاحبِ حکمتِ کاملہ!"

جیسے اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی سات آیات میں ایمان کے بنیادی اجزاء کا بیان تھا اور پھر کلمہ "فا" سے پرزور پیرائے میں دعوت ایمانی شروع ہوئی تھی' اسی طرح دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات و مضمرات کا بیان تھا اور اب پھر کلمہ "فا" ہی سے دعوتِ عمل شروع ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں تھوڑا سا غور کرنے پر ایک نہایت حسین ربط نظر آتا ہے کہ ایمانیات میں اولین ایمان ہے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہاں عمل کی دعوت اس بات سے شروع ہوئی کہ: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ "پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہاری حدِ استطاعت میں ہے" ـــــ گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں بلکہ امکانی حد تک' مقدور بھر۔ ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا' لہٰذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا بیان ہوا "سمع و طاعت" کے حوالے سے جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول ﷺ کی ذات و شخصیت ہے۔ آخر میں ذکر تھا ایمان بالآخرت کا جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے' لہٰذا تیسرے نمبر پر ذکر ہوا انفاق اور اللہ کو قرضِ حسن دینے کا!

۱۔ تقویٰ

عام طور پر "تقویٰ" کا ترجمہ "خوف" یا "ڈر" کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ یہ "تقویٰ" کے معنیٰ و مفہوم کی صحیح اور کامل ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک' خوفناک اور ڈراؤنی شے کا' تقویٰ سے یہ ڈر مراد نہیں۔ ایک خوف اور ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے' یعنی محبت بھرا خوف۔ یہ خوف تقویٰ کی کسی حد تک صحیح ترجمانی ہے۔ بغرضِ تفہیم مثال پیش خدمت ہے کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں یا آپ کے کسی کام سے ان کی دل شکنی ہو یا ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہو۔ گویا آپ اپنے والد کی ناراضی کے خوف سے جو ان کاموں کے ارتکاب سے احتراز کرتے ہیں جو انہیں ناپسند ہوں۔ پس آپ کے اس محبت بھرے خوف کو "تقویٰ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کے قلب اور ذہن پر ہر وقت یہ خیال مستولی رہے کہ میرے کسی قول اور میرے کسی عمل سے میرا خالق و مالک مجھ سے ناراض نہ ہو جائے' اور اسے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہے کہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے رب کو پسند نہ ہو۔ یہ کیفیت' یہ طرزِ عمل' یہ رویّہ اور یہ اندازِ فکر تقویٰ کی اصل حقیقت ہے!

قرآن حکیم میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۲ میں تقویٰ کے ضمن میں یہ شدید تاکید آئی ہے کہ : ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ....﴾ یعنی "اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے" ـــــ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ہی مضطرب اور پریشان ہو گئے تھے کہ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کا حق ہے' کون اختیار کر سکتا ہے!! بالکل ایسے جیسے کہ اللہ کی اتنی معرفت حاصل کرنا جتنی کہ اس کا حق ہے کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ رسولِ کامل اور عارفِ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ خود فرماتے ہیں :

"مَاعَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ" یعنی "(اے اللہ) ہم تیری بندگی نہ کرپائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے' اور ہم تجھے پہچان نہ سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے"۔ تو اگرچہ آنحضورؐ کے بارے میں تو یہی گمان ہے کہ یہ کلمات آپؐ نے بربنائے تواضع ارشاد فرمائے' لیکن کسی بھی دوسرے انسان کے بارے میں تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ کی "کماحقّہٗ" معرفت کا حصول اس کے دائرۂ اختیار اور حدِ امکان سے خارج ہے! یہی معاملہ تقویٰ کا ہے۔ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کے تقویٰ کا حق ہے' یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے' اس لئے کہ اس کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں' اور ہر وقت شعوری طور پر چوکنا اور چوکس رہیں کہ ہمارے اعضاء وجوارح سے کہیں اور کبھی کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہونے پائے جو اللہ کے کسی حکم یا منشاء کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس پر صحابہؓ کی تشویش بالکل بجا تھی۔ البتہ جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ "پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان اور حدِ استطاعت میں ہے" تب صحابہ کرامؓ کو تسکین حاصل ہوئی!

واضح رہے کہ یہی بات سورۃ البقرہ میں بھی ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ :﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ "اللہ کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتا مگر اس کی وسعت کے مطابق"۔ اور یہی اصول سورۃ المومنون میں بھی وارد ہوا ہے کہ : ﴿وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ "اور ہم کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتے مگر اس کی وسعت کے مطابق۔" البتہ اس مقام پر تھوڑا سا توقف کر کے استطاعت' استعداد اور وسعت کے بارے میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہئے اور وہ یہ کہ کسی انسان میں کتنی استطاعت واستعداد اور وسعت وطاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلّف اور جوابدہ ہے' اس کا صحیح شعور وادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا۔ بنابریں وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے اور دین کی جانب سے عائد ہونے والی مشکل اور کٹھن ذمہ داریوں سے خود کو بالکل ہی بری ٹھہرالیتا ہے۔ حالانکہ اللہ جو فاطرِ فطرت ہے' انسان کا خالق ہے اور اس کا علم کامل ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی

استطاعت' استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہر انسان کا اسی کے مطابق محاسبہ اور اور مواخذہ فرمائے گا۔ بلکہ اس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ ہم ع "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار!" کے مصداق اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں کہ جب دین اور نیکی کے کام کی بات ہوتی ہے یا تبلیغ و دعوت کی بات ہوتی ہے یا دین کے دوسرے عملی تقاضے اور مطالبے ادا کرنے کی بات ہوتی ہے تو ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں اس کی استطاعت و استعداد نہیں ہے۔ جبکہ دنیا کے معاملات میں ہماری جو لانیاں اظہر من الشمس ہوتی ہیں اور ہماری توانائیوں' ہماری تگ و دو اور ہماری اہلیت و صلاحیت کا نتیجہ بھرپور طور پر سامنے آرہا ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ ایک فریب ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر ایک شخص دنیا میں پھل پھول رہا ہے' اس کے جوہر نمایاں ہو رہے ہیں اور وہ دنیوی امور میں دوسروں سے آگے نکل رہا ہے اور ترقی پر ترقی کرتا چلا جا رہا ہے تو یہ استطاعت و استعداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ اس میں ذہانت' صلاحیت' قوتِ کار' وسعتِ عمل اور جذبۂ محنت و مسابقت موجود ہے' تب ہی تو وہ آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ لہٰذا صحیح روش اور درست رویّہ یہ ہو گا کہ بِرّ و تقویٰ کے تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں آگے بڑھنے کی شعوری طور پر اور امکان بھر کوشش کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رہنے دیا جائے اور اپنی امکانی حد تک نہ کوئی تساہل ہو اور نہ ہی کسی فراری ذہنیت کو بروئے کار آنے دیا جائے۔ البتہ یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس سب کے باوجود انسان اتنا ہی آگے بڑھ سکے گا جتنی اللہ تعالیٰ نے اس میں استطاعت و وسعت رکھی ہے' اگرچہ جب تک انسان اس کے لئے شعوری طور پر عزمِ مصمم کے ساتھ کوشش نہیں کرے گا اس وقت تک یہ ظاہر ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس میں وسعت' صلاحیت اور استطاعت کتنی ہے! رہا محاسبۂ اخروی کا معاملہ تو وہ یقیناً ہر شخص کی وسعت و استطاعت کی بنیاد ہی پر ہو گا جس کا صحیح علم اللہ کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا کہ کسی شخص نے اس وسعت و استعداد کے مطابق جو اسے دی گئی تھی دین کے مقتضیات و مطالبات پورے کرنے کی کس حد تک محنت اور کوشش کی۔

تقویٰ کے مفہوم کی بہترین تعبیر کے ضمن میں دورِ خلافتِ فاروقیؓ کا ایک بڑا عجیب واقعہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی محفل میں یہ سوال کیا کہ "تقویٰ" کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جو وضاحت پیش فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ :

"امیر المومنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو جس کے دونوں اطراف میں خار دار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھل سنبھل کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اس احتیاطی رویّے اور بچ بچ کر چلنے کو "تقویٰ" کہتے ہیں۔"

فاروقِ اعظمؓ نے اس تعریف کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت اُبَیؓ بن کعب کو داد دی۔ حقیقت اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ اس دنیا میں ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بھی ایک سفر ہی ہے اور یہاں ہر چہار طرف گناہ، معصیت اور شہوات و لذّات کی نہایت خار دار جھاڑیاں موجود ہیں، چنانچہ ہر ہر قدم پر گناہ کی ترغیب ہے، معصیت کی تحریک ہے اور طرح طرح کے ظلم و اِثم اور طغیان و عدوان کی دعوت موجود ہے! اب اگر انسان ان جھاڑیوں سے بچ کر نکل جائے اور اپنے دامن کو ان میں الجھنے نہ دے اور اس دنیوی سفر کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرے کہ اس کے دامن پر معصیت کا کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے پائے تو اس روش، اس رویّے اور اس طرزِ عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایمان کا اولین تقاضا ہے!

۲۔ سمع و طاعت

تقویٰ کے تاکیدی حکم کے بعد اس آیت میں دوسری بات فرمائی : ﴿وَاسْمَعُوا وَاَطِيعُوا﴾ "اور سنو اور اطاعت کرو"۔ اس سمع و طاعت کا تعلق بھی اصلاً تو ایمان باللہ ہی سے ہے، لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے، اس لئے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی

تو اللہ ہی ہے' مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل "مطاع" بن کر رسول آتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی" ـــــ اور ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ رسول کی یہ اطاعت اصلاً مطلوب ہے "سمع و طاعت" کی شان کے ساتھ یعنی بلاچون و چرا اور بلاپس و پیش! اس بات کو پورے شعور و ادراک کے ساتھ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک اطاعت تو وہ ہوتی ہے جو آپ کے فہم' آپ کی سمجھ اور آپ کی پسند پر منحصر ہے' یعنی یہ کہ اگر کوئی حکم آپ کی سمجھ میں آگیا یا آپ کو پسند آگیا تو آپ نے مان لیا اور اطاعت کی روش اختیار کرلی اور اگر وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا یا آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ نے اطاعت نہیں کی بلکہ لاپروائی اختیار کی۔ اس رویّے اور طرزِ عمل کا تجزیہ کیجئے تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ یہ اطاعت اُس ہستی کی نہیں ہے جو حکم دے رہی ہے' بلکہ اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار اور عقل و منطق کی رُو سے یہ خود اپنی سمجھ یا اپنے جی کی اطاعت ہے' اور دونوں صورتوں میں آپ نے یا اپنی عقل کی' یا اپنے جی کی' یا اپنی پسند کی اطاعت کی ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تو اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ جو بھی حکم ملے' اس پر سرِ تسلیم خم کردیا جائے' جو فرمان بھی سامنے آئے بجالایا جائے' جس چیز سے روک دیا جائے اس سے رک جایا جائے! اور اگر ان اوامر و نواہی کی حکمتیں بھی سمجھ میں آجائیں تب تو کیا ہی کہنے ہیں' یہ تو "نورٌ علیٰ نور" والی بات ہے' لیکن اگر کسی حکم کی غرض و غایت یا حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے تب بھی مجرد "سمع" یعنی سن لینے سے "طاعت" یعنی فرمانبرداری لازم آ جاتی ہے!

عملی اعتبار سے اس "سمع و طاعت" کا نقطۂ آغاز نبی ﷺ کی ذات اور شخصیت ہے' اس لئے کہ آپؐ ہی پر وحی جلی کے ذریعے وہ حکمت عطا فرمائی گئی جس کی روشنی میں آپؐ نے اللہ کے کلام کی توضیح و تبیین اپنے فرامین و فرمودات کے ذریعے کی۔ اور اس کا عملی نمونہ اپنی سیرت و کردار اور اپنے افعال و اعمال کے ذریعے پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ

انؐ کے بارے میں وضاحت کر دی گئی کہ : ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○﴾ "اور وہ (ہمارے رسولؐ) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو (ان پر نازل) کی جا رہی ہے"۔ اسی کی ترجمانی ہے فارسی کے اس شعر میں۔

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

گویا رسول ﷺ کے احکام ان کی خواہشات پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی وحی پر مبنی ہوتے ہیں۔ تمہارا ذہن، تمہارا فکر، تمہاری عقل اور تمہاری سوچ محدود ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی حکمت و علّت تمہاری سمجھ میں آجائے اور ہر حکم کی مصلحت تمہارے فہم کی گرفت میں آسکے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت "سمع و طاعت" کی شان سے ہوگی، اور عقل انسانی کو ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اس پر کسی قسم کی حدود و قیود عائد کرے۔ البتہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی مسلمان ہیئتِ اجتماعیہ کے سربراہ یعنی کسی حاکم یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایسی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ ہر "اطاعت" کے ساتھ "فی المعروف" کی قید لازمی ہے۔ یعنی اب ہر اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) یعنی مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ البتہ "فی المعروف" کی پابندی اور مشاورتِ باہمی کا حق ادا کرنے کے بعد اسلامی معاشرے اور نظمِ جماعت میں درجہ بدرجہ ڈسپلن کی شان "سمع و طاعت" والی ہی ہونی چاہئے تاکہ معاشرہ اور ہیئتِ اجتماعی پوری طرح منظم اور چاق و چوبند رہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

زیر مطالعہ آیت کی تیسری اور آخری بات کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : ﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ﴾ "اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اسی میں

تمہاری بھلائی مضمر ہے!" اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غرباء' فقراء' مساکین اور یتامیٰ کے لئے بھی ہے اور اللہ کے دین کے لئے بھی! اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ بڑا گہرا مگر لطیف تعلق ہے' اس لئے کہ جسے آخرت پر یقین حاصل ہو وہ جو مال اللہ کے لئے صرف کرے گا اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہو گا کہ یہ مال محفوظ ہو گیا' گویا اللہ کے بینک میں جمع ہو گیا۔ اب یہ بات بالکل ظاہر و باہر اور حتمی و یقینی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہتر حاصل آخرت کے بینک میں جمع کرا دیا ہو تو ایسے شخص کی کیفیت موت کے وقت بالکل وہی ہو گی جو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مومن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اپنے مال و دولت اور اپنی توانائیوں اور قوتوں کا بہت بڑا حصہ اللہ کے بینک میں جمع کرا رکھا ہے اور اب میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت' میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے نام سے اِس وقت جو کتابیں موجود ہیں' ان میں سے متی کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے کہ "اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو' جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری ڈاکے کا بھی خوف ہے بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے' نہ چوری کا خوف ہے' نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا"۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ بھی بڑا عجیب اور پیارا ہے' ان کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ حضور ﷺ کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو سیّدہ صدیقہؓ نے ایک دستی بچا کر رکھ لی اور باقی سارا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جب نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو آپؐ نے دریافت فرمایا : مَا بَقِیَ مِنْھَا؟ یعنی "اس بکری میں سے کیا بچا؟"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا : مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا یعنی "اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک دستی کے"۔ اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا : بَقِیَتْ کُلُّھَا اِلَّا کَتِفُھَا یعنی "پوری بکری بچ گئی سوائے اس دستی

کے!" یعنی اس دستی کو تو ہم کھالیں گے اور جو کھالیا گیا وہ تو خرچ ہو گیا' البتہ جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا' وہ باقی رہنے والا ہے' وہ اصل بچت ہے۔ لہٰذا ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آنی چاہئے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا ہے وہ حقیقی بچت ہے۔ یہی تعلیم و تلقین ہے ان الفاظ مبارکہ میں ﴿وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ﴾ "اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو' یہی تمہارے لئے بہتر ہے"۔

آگے متنبہ فرمادیا کہ اگر مال کی محبت تمہارے دل میں باقی رہی اور تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی رہی تو یہ بخل ہے: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ﴾ "اور جو اس شُح سے' بخل سے' جی کے لالچ سے بچالیا گیا" وہی انفاق میں آگے بڑھ سکے گا' اور اس صورت میں وہ کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکے گا۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: ﴿فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ "پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے۔" فلاح کسی کے منزلِ مراد پر پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں واضح فرمادیا گیا کہ جو اس شُحِ نفس سے' مال کی محبت اور جی کے لالچ سے بچالیا گیا وہی آخری منزلِ مراد تک رسائی حاصل کر سکے گا!!

اگلی آیت میں انفاق پر ایک نہایت مؤثر اسلوب سے مزید زور دیا جارہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ﴾ "اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ اسے تمہارے لئے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا۔" اللہ کی راہ میں اگر انفاق کیا جائے' خرچ کیا جائے' مال لگایا اور کھپایا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ہماری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کے لئے اپنے ذمّے قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کی رضاجوئی کے لئے مال خرچ کرنے کی دو مدّات ہیں' ایک مدّ یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو صاحبِ احتیاج ہیں یعنی غرباء و فقراء' یتامیٰ و مساکین' بیوائیں اور ایسے لوگ جو کسی سبب سے معاشی جدّوجہد میں پیچھے رہ گئے ہیں ان کی مدد کی جائے' اور دوسری مدیہ ہے کہ اللہ کے دین کی نصرت کے لئے خرچ کیا جائے۔ یعنی اس کے دین کی نشرواشاعت اور دعوت کے لئے صرف کیا جائے اور دین حق کے غلبہ اور اقامت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی ضروریات کی فراہمی پر صرف کیا جائے۔ اگرچہ قرآن مجید

میں اکثر و بیشتر مقامات پر ان دونوں مدّات کا ذکر مشترک انداز میں آتا ہے لیکن جابجا ان کے لئے علیحدہ اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ پہلی مد کے لئے بالعموم "ایتاءِ مال" اور "صدقہ" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور دوسری مد کے لئے عموماً جہاد بالمال اور انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاحات اختیار کی جاتی ہیں' جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں: ﴿وَجَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ "اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔" اور اسی کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض سے بھی تعبیر فرماتا ہے' حالانکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے' جیسے کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے۔" اور کہیں ارشاد ہوا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "اور آسمانوں اور زمین کے جملہ خزانے اللہ ہی کے لئے ہیں"۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہمارے اس انفاق کو اپنی قدر دانی کے اظہار اور حوصلہ افزائی کے لئے اپنے ذمہ قرضِ حسن قرار دیتا ہے۔ پھر دنیا کے قرضِ حسن میں تو صرف رأس المال کے واپس ملنے کی امید ہوتی ہے اور کسی اضافے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لئے کہ یہاں قرض پر اضافہ سود ہے جو ہمارے دین میں مطلقاً حرام ہے۔ لیکن انفاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ کو جو قرضِ حسن دیا جاتا ہے اس کے بارے میں وہ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اسے بڑھاتا رہے گا اور اس میں اضافہ کرتا رہے گا۔ مزید برآں اس کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نہایت حسین و جمیل جوڑا آیا ہے اور اس میں قرآن کے عام اسلوب کے مطابق نہایت گہرا معنوی ربط ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ۝﴾ "اور اللہ شکور (یعنی قدر دان) بھی ہے اور حلیم (یعنی بردبار) بھی۔" یعنی اگر تم اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو' خرچ کرتے ہو تو وہ قدر افزائی فرمانے والا ہے' اور اس کے برعکس اگر بخل کرتے ہو' نفس کے شُح اور حرص کے لالچ ہی میں مبتلا رہتے ہو اور اسی کا عطا کردہ مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' بلکہ مال کو سینت سینت کر رکھتے ہو تب بھی وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے کیونکہ وہ بڑا حلیم اور بڑا بردبار ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت بھی بڑی عجیب اور بہت پیاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾ "(وہ اللہ) چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے، زبردست ہے، کمال حکمت والا!" آیت کے آخر میں پھر دو اسمائے حسنیٰ جوڑے کی صورت میں آئے ہیں، یعنی وہ "العزیز" بھی ہے اور "الحکیم" بھی۔ گویا ایک جانب اللہ غالب ہے، زبردست ہے، مختارِ مطلق ہے، اس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ الحکیم بھی ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر دیکھئے یہاں صفات و اسماء کے دو جوڑوں یعنی "شَكُورٌ حَلِيمٌ" اور "الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" کے درمیان اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان ایک نئی شان کے ساتھ آگیا۔ یعنی وہ غائب و حاضر چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب اہل ایمان، اصحابِ بِرّ و تقویٰ اور طاعت و انفاق پر کاربند رہنے والوں کے لئے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض و انکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے تہدید و تنبیہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ تمہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے کامل غلبہ و اقتدار کا مالک ہے! اس لئے کہ وہ "العزیز" ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیئے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے، اس لئے کہ جہاں وہ "العزیز" ہے وہاں "الحکیم" بھی ہے۔ ○○

بقیہ : لغات و اعراب قرآن

إِلَّا / بِإِذْنِ اللّٰهِ، بِإِذْنِ اللّٰهِ، بِإِذْنِ اللّٰهِ / وَيَتَعَلَّمُونَ (مثل سابق) مَا يَضُرُّهُمْ / وَلَا، لَا يَنْفَعُهُمْ / وَلَقَدْ، لَقَدْ / عَلِمُوا، عَلِمُوا / لَمَنْ، لَمَنِ / اشْتَرٰهُ، اشْتَرَاهُ، اشْتَرٰهُ / مَا / لَهُ، لَهُ، لَهُ / فِي الْاٰخِرَةِ، الْاٰخِرَةِ، الْاٰخِرَةِ / مِنْ، مِنْ / خَلَاقٍ، خَلَاقٍ، خَلَاقٍ / وَلَبِئْسَ مَا / شَرَوْا، شَرَوْا / بِهٖ / اَنْفُسَهُمْ، اَنْفُسَهُمْ / لَوْ كَانُوْا، كَانُوْا / يَعْلَمُوْنَ، يَعْلَمُوْنَ / وَلَوْ اَنَّهُمْ، اَنَّهُمْ / اٰمَنُوْا، ءَ امَنُوْا، اٰمَنُوْا / وَاتَّقَوْا، وَاتَّقَوْا، وَاتَّقَوْا / لَمَثُوْبَةٌ، لَمَثُوْبَةٌ / مِنْ، مِنْ / عِنْدِ، عِنْدِ اللّٰهِ / خَيْرٌ۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (مثل سابق)

خاندانی منصوبہ بندی
قرآن وحدیث کی روشنی میں

مولانا عبد الغفار حسن

اولاد کی کثرت کے بارے میں آج کل دو قسم کے خیالات یا نظریئے پائے جاتے ہیں :

۱ - اولاد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے' اس کی کثرت باعثِ برکت ہے نہ کہ موجب زحمت۔

۲ - آبادی کے اضافے سے بہت سے پریشان کن مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وسائلِ رزق محدود ہیں۔ اگر آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو آئندہ نسلوں کو کہاں سے روزی ملے گی' اس لئے اولاد کم سے کم پیدا کرنی چاہئے۔

قرآن وحدیث کی تعلیم کے مطابق پہلا نظریہ درست اور دوسرا غلط ہے۔ ذیل میں دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

دلیل(۱) :

﴿وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ﴾

(الانعام : ۱۵۱)

"اور مفلسی کی بناء پر اپنی اولاد کو قتل نہ کرو (کیونکہ) ہم (ہی) تم کو (بھی) رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی (دیں گے)۔"

دلیل(۲) :

﴿وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ...﴾ (بنی اسرائیل : ۳۱)

"(لوگو) افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو' ہم ہی انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔"

قرآنی بلاغت کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر اور کہیں کسی ایک لفظ کے

اضافے سے دونوں آیات کے مفہوم میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پہلی آیت میں مخاطب کی ضمیر مقدم ہے یعنی "کُمْ" اور دوسری آیت میں غائب کی ضمیر مقدم ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں "ھُمْ" ضمیر غائب مؤخر ہے اور دوسری آیت میں "کُمْ" ضمیر مخاطب مؤخر ہے۔ اندازِ بیان کا دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں "مِنْ اِمْلَاقٍ" آیا ہے' یعنی موجودہ فقر و فاقہ کی بناء پر۔ اور دوسری آیت میں لفظ "خَشْیَۃَ" (اندیشہ) بیان ہوا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں دو قسم کے گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک وہ جو یہ سمجھتا تھا کہ ہم خود فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں' اولاد ہو گی تو کہاں سے کھلائیں گے۔ اور دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ ہمیں تو روزی میسر ہے لیکن ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ ہونے والی اولاد کو بھی کھلا سکیں۔ اس بناء پر قرآن نے ان کو تنبیہہ کی ہے کہ تمہاری روزی کے بھی ہم کفیل ہیں اور ان کے رزق کے بھی۔

دوسری آیت میں دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمہیں اپنی اولاد کے لئے فکر مند نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کہاں سے کھائے گی۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ تمہاری ہونے والی اولاد کو اور تم کو اپنے رزق سے مالا مال کرے گا۔ اسی حقیقت کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "بڑے گناہوں میں سے ایک گناہ یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے کی بناء پر قتل کر دو کہ وہ تمہاری روزی میں حصہ بٹائے گی۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں : اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَطْعَمَ مَعَکَ (بخاری و مسلم) تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے تفسیر ابن کثیر' ج ۲' ص ۱۸۸۔

ایک لطیف نکتہ

اس آیت (الانعام : ۱۵۱) میں قتلِ اولاد کی ممانعت کے بعد بدکاری کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ فواحش کی فراوانی کی شکل میں نکلے گا۔ اصل الفاظ یہ ہیں :

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ... ﴾

"اور بے حیائی کی باتوں کے پاس بھی نہ پھٹکنا (خواہ) وہ علانیہ ہوں یا پوشیدہ۔"

اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں قتلِ اولاد کی ممانعت کے بعد فرمایا :

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً ۖ وَسَاءَ سَبِيلًا ۝﴾

"اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو' یقیناً وہ بڑی بے حیائی (کی بات) ہے اور (بہت ہی) برا چلن۔"

اسی طرح حدیث میں بھی قتلِ اولاد کی ممانعت کے بعد زنا کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں : اَنْ تَزْنِیَ حَلِیلَةَ جَارِکَ یعنی بڑے گناہوں میں ایک یہ ہے کہ انسان اپنی پڑوسن سے بدکاری میں مبتلا ہو۔

مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں :

"اِمْلَاق کے معنی فقر و تنگ دستی کے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں "خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ" کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس اندیشے سے کہ اولاد کیا کھائے گی' کہاں سے اس کی پرورش ہو گی' اس کو قتل نہ کرو۔ اہل عرب میں قتلِ اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا' جس کا ذکر اسی سورۃ میں پیچھے گزرا ہے۔ دوسری صورت یعنی قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی' جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فاقے کے اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ ظالمانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آجاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مسائل میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے۔ حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اصلاً اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض عائد ہوتے ہیں' وہ اپنے امکان کی حد تک ادا کرے۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزّاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں یہ وہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار

آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے' یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے۔ تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہوا کھاتا ہے' پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشے سے قتل کرے کہ میں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ : نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ہم ہی تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی (دیتے ہیں)۔

افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرہ اختیار اور اپنے فطری اور شرعی حدودِ کار سے متجاوز ہو کر ان حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں جو قدرت کے حدود ہیں۔ اس تعدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلق کے لئے کوئی مفید کام کرنے کی جگہ وہ اپنی صلاحیتیں نظامِ قدرت سے زور آزمائی میں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کے لئے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائلِ معاش کو ترقی دینے کے لئے بر و بحر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشہ کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی الٹے بغیر نہ چھوڑے' یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرض میں سے ہے کہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں' خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ' اجتماعی ہو یا خاندانی' احتیاط' اعتدال' کفایت شعاری' صحت و صفائی اور محنت کی تربیت دے' لیکن یہ امر بالکل اس کے دائرہ اختیار اور حدودِ کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلہ پیدا کریں گے اور اس حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی مزید ناخواہدہ مہمان نے ہماری نپی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔

غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس معاملہ میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگ دلوں کو لاحق ہوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انہیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو دم بدم اولاد میں کیوں اضافے کئے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولاد کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانہ کے متمدن انسان کو بھی برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیار زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح

اٹھالیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم بناڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں۔ عرب اجڈ اور گنوار تھے' اس وجہ سے انہوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی۔ موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے' اس وجہ سے اس نے ایک خوبصورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈ نکالا ہے' لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انہوں نے بھی رزّاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزّاق اپنے کو سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ رزّاق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کردی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے' مان بھی گئے' لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے۔" (تدبر قرآن' ص ۱۹۹۔۲۰۰' ج ۳)

مولانا اصلاحی صاحب دوسری جگہ آیت "وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" کے ضمن میں رقم طراز ہیں :

"اور اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔" یعنی اولاد جو ازدواجی زندگی کا اصل مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمہارے اختیار یا اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس چیز کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل عنایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بقائے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے۔ اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تو اس کا چھاپ انسان پر برا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصل عنایت پر ہو تو یہ بھی عبادت ہی میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبطِ ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل مقصد کی اہمیت دے رہی ہے۔" (تدبر قرآن' ص ۴۵۸۔۴۵۹' ج ۱)

ایک تیسری آیت "نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ" کے ضمن میں مولانا اصلاحی صاحب لکھتے ہیں :

"حرث" کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں' عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔ عورتوں کے لئے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لئے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک

موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے' نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں' کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے' کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا' اسی طرح عورت کے لئے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایامِ ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اس سے قضائے شہوت نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جہام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہے' اور غیر محل میں مباشرت باعثِ اذیت واضاعت ہے۔ اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لئے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ اپنے اس پہلو سے یہ آیت اوپر والی آیت کی گویا توضیح مزید ہوئی۔"

آگے رقم طراز ہیں :

"ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید' کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اپنی کھیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان' جس آن' جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے' اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔

اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے اسے برابر نہایت اچھی فصل حاصل ہوتی رہے' مناسب وقت پر اس میں ہل چلتے رہیں' ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا رہے' موسمی آفتوں سے وہ محفوظ رہے' آئند و روند' چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں' جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

قرآن نے عورت کے لئے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریئے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی

منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لئے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔" (تدبر قرآن ص ۵۲۷۔۵۲۸، ج ۱)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت "وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" کے ضمن میں رقم طراز ہیں :

"یہ آیت ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر، یعنی منع حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشور اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائش نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے، اتنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزول قرآنی کے دور سے لے کر آج تک کسی دور میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہونے پایا۔" (تفہیم القرآن، ص ۶۱۳، ج ۲)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس آیت "وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" کے ضمن میں

فرماتے ہیں :

"اور اسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (بصورتِ اولاد اور بطورِ میاں بیوی کی یکجائی کے قدرتی نتیجہ کے۔ مَا کَتَبَ اللّٰہُ سے مراد اولاد صالح ہے۔ عمل مباشرت اگر صحیح سن میں اور مناسب وقت پر ہو تو بڑی گہری طبعی لذت بھی رکھتا ہے، لیکن اسلام نے اس عمل سے اصلی اور بڑا مقصد افزائش نسل اور حصول اولاد رکھا ہے کہ امت کی قوت اور کثرت میں برابر اضافہ ہوتا رہے اور ذاتی لذت اجتماعی منفعت کا ذریعہ بنتی رہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کھانے پینے کی لذت طبعی ذریعہ بنتی ہے فرد کی حیات وبقاء کا اور اس کی تقویتِ جسم کا۔ ما قضی اللّٰہ لکم من عملٍ صالح لا بن عبّاس یعنی الوَلَد قالہ اکثر المفسرین (معالم) اور ابن کثیر نے اسی معنی کی تائید میں صحابہ اور اکابر تابعین تک کا اجماع نقل کیا ہے۔ کَتَبَ "لکھ رکھا ہے" یعنی لوح محفوظ میں اپنی مشیتِ تکوینی میں (معالم) ای اَثْبَتَ فِی اللَّوح مِنَ الوَلد (کشاف) "وَابْتَغُوا" سے صاف اشارہ نکل رہا ہے کہ مطلوب افزائشِ نسل ہے نہ کہ ارادی لاولدی یا عزل۔ قیل ھو نھی عن العزل (کشاف) (قیل کذا بیضاوی) یعنی اس آیت کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ عزل ناجائز ہے۔

منع حمل اور قطع نسل کی جس جدید تحریک کا اس وقت زور ہے اور جو "ضبطِ تولید" وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے، قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں اس سب کی تردید کردی ہے اور بتا دیا کہ مباشرت کا جو نتیجہ قدرتاً اور طبعاً نکلتا ہے اس کی توقع رکھنی چاہیے اور اسی کا انتظار کرنا چاہئے۔ عام قاعدہ اصولی عمومی یہی ہے۔ باقی اجتماع تزوج کے قدرتی نتیجوں کو بلاوجہِ خاص اور ضرورتِ شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دور کرنا نہیں جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد و قوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کو دعوت دینا ہے۔ انتہائی کوششوں کے باوجود ابھی تک تو کوئی پوری طرح "حمل روک" آلہ دریافت نہیں ہو سکا۔ اب تک کوئی مانع حمل ایسا دریافت نہیں ہو سکا ہے جو ہر طرح قابل اطمینان ہو۔ یعنی قطعی بے ضرر ہو اور سادہ ہو۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج ۳، ص ۶۵۰، ط۔۱۴)

"اور پھر اگر کوئی بے خطا اور مکمل تدبیر دریافت ہو بھی گئی تو منع حمل کی جسمانی ضرورتوں کے تدارک کی کیا صورت ہوگی؟ یہ باور کرنا دشوار ہے کہ یہ عمل (امتناع) بار بار کیا جائے اور اس کے مضر اثرات مرد و عورت کے اعلیٰ صفات پر مرتب نہ ہوں۔"
(ایضاً ص ۶۵۱)

یہ اگر مان بھی لیا جائے کہ جلد جلد استقرارِ حمل اور وضعِ حمل سے عورت کی صحت خراب ہو جاتی ہے تو بھی خود طبِ جدید کا فتویٰ یہی ہے کہ عورت کو زمانہ حمل میں صنفی اعمال سے جو مہلت مل جاتی ہے نیز وضع حمل کے بعد رضاعت وغیرہ کی مشغولی، تو یہ سب عورت کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کے تابع نہیں رہتی۔ چنانچہ ایسے والدین کی مثالیں بارہا مشاہدہ میں آ چکی ہیں کہ پہلے تو انہوں نے امتناع کی صناعی (مصنوعی) تدبیریں اختیار کر کے اپنے اعضاء تولید کی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا اور پھر آگے چل کر جب اولاد کی خواہش یا ضرورت محسوس کی تو اپنی سابقہ حرکتوں پر پچھتائے۔ یہ سب تصریحات انسائیکلو پیڈیا ہی سے ماخوذ ہیں۔

متعدد ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں اور ماہرین سائنس نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بے ہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبعی مضرتیں کھل کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں۔ بلکہ یورپ کے متعدد ممالک تو اس تحریک کے نتائج سے تنگ آکر اور طویل تجربوں کے بعد بالآخر اسی پر مجبور ہوئے کہ ماؤں کے لئے انعام دیں اور ہر نئی زچگی پر ایک نیا انعام دیں۔ جرمنی اٹلی وغیرہ سے تو یہ خبریں کئی سال سے آنا شروع ہو گئی تھیں اور اب روس، فرانس وغیرہ سے عین دورانِ جنگ میں آنے لگی ہیں۔ (یہ سطور ۱۹۴۳ء میں دوسری جنگ عظیم میں لکھی جا رہی ہیں) اور بالآخر بات اسی کی سچ نکلی اور اسی کی بلند رہی جس نے کہا تھا کہ "تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ" شادیاں کرو زیادہ بچے جننے والی اور خوب محبت کرنے والی بیبیوں سے۔

"وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ" (انعام۔ ۱۰۱) سے قتل اولاد کی ملعون رسم، دختر کشی کے دستور کے علاوہ مقصود اس سے تمام تر روکنا ہے۔ افلاس کا ذکر

اس لئے فرمایا کہ فلاسفہ مادیّین اور مفکرینِ جاہلیت اپنے نظریہ کی عقلی توجیہ عموماً یہی کرتے ہیں۔ چنانچہ آج جاہلیتِ فرنگ کے زیر سایہ جو شاندار تحریک قتل اولاد کی خفی و باریک صورت "منعِ حمل" کے نام سے جاری ہے' اس کا محرک بھی یہی خوفِ افلاس ہے۔

مالتھس نامی ایک ماہر معاشیات جو برطانیہ میں ۱۹ویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوا ہے اور قتل اولاد یا "منع حمل" کی تحریک اصلاً اسی کی چلائی ہوئی ہے' اس کے سارے نظریہ کی بنیاد یہی خوفِ افلاس ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن (وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ) اور بعض علماءِ سنت نے آیت کے ان الفاظ سے عزل یعنی منع حمل بلا آلات کے عدم جواز پر بھی استدلال کیا ہے۔

وقد يستدل بهذا من يمنع العزل لان الواد يرفع الموجود والنسل والعزل منع اصل النسل فتشا بها الا ان قتل النفس اعظم وزرًا واقبح فعلًا (قرطبی۔ ج ۴' ص ۱۳۲' سورۃ الانعام' پ ۸)

جو لوگ عزل کو ناجائز سمجھتے ہیں وہ اس آیت سے عزل کی ممانعت پر استدلال کرتے ہیں کیونکہ زندہ درگور کرنے سے موجودہ اولاد بھی ختم ہو جاتی ہے اور آئندہ آنے والی نسل کا بھی راستہ بند ہو جاتا ہے اور یہ آئندہ ہونے والی نسل کو روکنے کی ایک شکل ہے لہٰذا دونوں صورتیں ایک ہی طرح کی ہیں' فرق اتنا ہے کہ کسی جان کا قتل بڑا گناہ ہے اور یہ نہایت ہی برا کام ہے۔

﴿ وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ﴾ (بنی اسرائیل : ۳۱)

منع حمل کے ذریعے قتل اولاد کے نظریہ کی قرآن مجید تردید کرتا ہے۔ متعدد جاہل قوموں کا نظریہ یہ رہا ہے کہ افرادِ کاسبہ چونکہ عورتوں میں نہیں صرف مَردوں میں پیدا ہوتے ہیں' اس لئے عورت کو قومی دولت میں شرکت کا اور زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ عرب جاہلیت میں بھی یہی نظریہ عام تھا :

العرب كانوا يقتلون البنات لعجز البنات عن الكسب و قدره البنين عليه بسبب اقدامهم على النهب والغازه (كبير)

عرب کے باشندے اپنی لڑکیوں کو قتل کرتے تھے اس بناء پر کہ وہ روزی کما نہیں

سکتیں' بر خلاف نرینہ اولاد کے کہ وہ روزی کمانے پر قدرت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرد جس طرح لوٹ مار اور قتل و غارت کرسکتے ہیں، (عورتیں اس طرح نہیں کر سکتیں)۔"

مولانا وحید الدین خان صاحب آیت "وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

"انسان اپنے حرص اور ظلم کی وجہ سے خدا کے پیدا کئے ہوئے رزق کو تمام بندوں تک منصفانہ طور پر پہنچنے نہیں دیتا اور جب اس کی وجہ سے قلت کے مصنوعی مسائل پیدا ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ کھانے والوں کو قتل کردو یا پیدا ہونے والوں کو پیدا نہ ہونے دو۔ اس قسم کی باتیں خدا کے نظامِ رزق پر بہتان کے ہم معنی ہیں"۔
(سورۃ انعام' تذکیرالقرآن' جلد ا' ص ۳۵۴)

اور سورۂ بنی اسرائیل میں آیت "وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" کی تفسیر میں مولانا وحید الدین خان صاحب لکھتے ہیں:۔

"خدا ہی نے تمام جانوروں کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان کے رزق کا انتظام کرتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کا کسی کو رزق کی تنگی کا نام لے کر ہلاک کرنا' ایک ایسا کام کرنا ہے' جس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جب رزق کا انتظام خدا کی طرف سے ہو رہا ہے تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کسی جان کو اس اندیشے سے ہلاک کرے کہ وہ کھائے گی کیا؟"

"ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی" کے الفاظ کے ذریعہ انسان کے ذہن کو اس معاملے میں تخریب کے بجائے تعمیر کی طرف موڑا گیا ہے۔ غور کیجئے کہ جو انسان موجود ہیں وہ اپنا رزق کس طرح حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اس کو خدا کے فراہم کردہ پیداواری وسائل پر عمل کرکے حاصل کر رہے ہیں۔ یہی طریقہ آئندہ آنے والی نسل کے لئے بھی درست ہے۔ تم کو چاہئے کہ مزید پیدا ہونے والوں کو خدا کے پیداواری وسائل پر مزید عمل کرنے پر لگاؤ نہ کہ خود پیدا ہونے والوں کی آمد کو روکنے لگو۔" (سورۃ بنی اسرائیل' آیت ۳۱' تذکیرالقرآن' ص ۷۷۰' جلد۔ا)

مذکورہ بالا تفسیری اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی چار آیات ایسی ہیں' جن سے موجودہ خاندانی منصوبہ بندی کے نظریہ کی ممانعتِ کلی نکلتی ہے :

۳) "مانع حمل گولیوں نے جنسی تعلقات کی افزونی پر گہرا اثر ڈالا ہے کیونکہ اس سے غیر مطلوبہ حمل کا خطرہ کم ہو جاتا ہے اور اس طرح مردوں اور عورتوں کے لئے عصمت و عفت کا دوہرا معیار ختم ہوتا جارہا ہے۔ اگر عورت حمل کا خطرہ مول لئے بغیر جنسی تعلقات قائم کرسکتی ہے تو یہ مشکل ہی سے ممکن ہے کہ اس سے مطالبہ کیا جاسکے کہ وہ باعصمت رہے۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' ج ۷' ص ۱۶۰' طبع ۱۹۸۰ء)

۴) "بعض مغربی ممالک میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں مانع حمل گولیوں اور دیگر طریقوں کے باوجود ناجائز بچوں کی پیدائش میں اضافہ ہوا ہے لیکن تازہ رجحان کے طور پر صورت حال الٹ ہوئی ہے' خصوصاً نوجوان لڑکیوں میں۔ کیونکہ یہ لڑکیاں باقاعدگی سے مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' ج ۷' ص ۱۰۹' طبع ۱۹۸۰ء)

۵) مغربی معاشروں میں تو فحاشی اس قدر مذموم شے نہیں کیونکہ "مغربی ثقافت جنسی تسکین کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' ۱۵واں ایڈیشن' طبع ۱۹۸۰ء' ج ۱۹' ص ۱۰۹۵)۔

ضبطِ تولید کے نقصانات

عورت کی صحت و زندگی کو نقصان

۱) تحقیقات سے ظاہر ہوا ہے کہ ضبطِ تولید کی گولیوں کے استعمال سے متعدد خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان گولیوں کے استعمال اور چھاتی و رحم کے سرطان میں ممکنہ تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ ان گولیوں کے استعمال سے جن علامتوں کے پیدا ہونے کی شہادت ملتی ہے' ان میں بڑھتا ہوا اعصابی تناؤ اور دیگر حیاتیاتی طرز کی کیمیائی تبدیلیاں شامل ہیں۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ رحمی بیضے کے تخلیقی عمل کو نقصان پہنچے۔ یہ گولیاں انسان کے جسم میں جن بیماریوں میں شدت پیدا کرسکتی ہیں' ان میں دمہ' پھوڑے پھنسی' درد شقیقہ' گنجاپن' سرخ دانے' سارے جسم میں اعصابی تکالیف (بشمول رعشہ اعضاء) اور خوراک کے جزو بدن بننے کے عمل میں غیر معمولی

رکاوٹیں (جس سے پاگل پن واقع ہو سکتا ہے) شامل ہیں۔ سب سے بدترین خطرہ یہ ہے کہ خون کے جم جانے کی تکلیف میں نوگنا اضافہ ہو سکتا ہے (اس انجماد سے خون یا پلازمہ کے لوتھڑے بننے لگتے ہیں) (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' ج ۲' ص ۱۰۶۸' طبع ۱۹۸۰ء)

۲) "نس بندی (Sterilization) کا تسلی بخش ذریعہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔" (انسائیکلوپیڈیا' ج ۲' ص ۱۰۶۹)

۳) "اسقاطِ حمل کے بعد انسان میں جرم کا احساس' جنسی تعلقات میں بگاڑ اور ذہنی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ اسقاط حمل کرانے والی عورتوں کی زیادہ تعداد حالات کے ساتھ مطابقت نہیں کر پاتی۔ یوگوسلاویہ میں ایک مطالعہ کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ اسقاط کرانے والی صرف ۲۴ فی صد عورتیں نارمل رہ سکیں"۔ (گویا ۷۶ فی صد عورتیں غیر معمولی حالات کا شکار ہو گئیں)....(انسائیکلوپیڈیا' ج ۲' ص ۱۰۶۸)

۴) "مانع حمل طریقوں کے اہم مسائل میں ابھی تک جزوی نتائج' مسلسل استعمال کی ضرورت' زہریلے اثرات اور غیر مطلوبہ اضافی اثرات کے خطرات پائے جاتے ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' ج۔ ۲' ص ۱۰۷۰)

۵) "وسیع طور پر استعمال ہونے والی مانع حمل گولیوں کے کچھ اجزاء کے بارے میں دیکھا گیا ہے کہ ان کی زیادہ طاقت کی خوراک استعمال کرنے پر چھاتی کا سرطان پیدا ہو جاتا ہے۔" (انسائیکلوپیڈیا' ج ۳' ص ۷۶۴)

۶) "بچے کی پیدائش کو روکنے والی ادویات کے اخراجات اس سے بہت کم ہو سکتے ہیں جو بچے کی معاشی زندگی کے لئے ضروری اشیاء (مکان' خوراک وغیرہ) کی تیاری پر صرف ہوتے ہیں' لیکن یہ اخراجات اس وقت کم ہوں گے جب یہ مانع حمل ادویات و آلات خاصے یقینی ہوں۔ جب ان کی کارکردگی عملاً صفر ہو جیسا کہ عام اور جاہل آبادی میں ہے تو معاشی ترقی بہت زیادہ منافع بخش ثابت ہوتی ہے۔" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' ج ۱۴' ص ۸۲۳)

قوم میں قوتِ کار کی کمی

"جن معاشروں میں افزائشِ نسل کی طرف کم توجہ دی گئی انہیں مٹ جانے کے خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔" (انسائیکلوپیڈیا' ج ۷' ص۔۱۵۶)

معاشرتی نقصانات

۱) "مغربی ثقافت جنسی تسکین کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔" (انسائیکلو پیڈیا ج ۷' ص ۱۵۶)

۲) "ایک عام شادی شدہ جوڑے کو صاحب اولاد ہونا چاہئے۔ جو لوگ اولاد مؤخر کرتے ہیں بعد میں انہیں اس پر نادم ہونا پڑتا ہے۔ شادیاں نت نئے مسائل کو جنم دیتی ہیں۔ زوجین خواہ ایک دوسرے سے مطمئن ہوں' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان پر شدید قسم کی بدمزگی اور بے کیفی مسلط ہو جاتی ہے' گویا کہ وہ اپنے سفر کے اختتام پر پہنچ گئے ہوں۔ ضبطِ ولادت سے عورت کی مادری جبلت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے' جس سے اس کا نظامِ اعصاب پراگندہ ہو سکتا ہے' اس کی صحت تباہ ہو سکتی ہے اور زندگی میں اس کی تمام خوشی اور دلچسپی خاک میں مل سکتی ہے۔"

Alexander James N. The Psycologist Magazine London, June 1961, p-5

(بحوالہ اسلام اور ضبط ولادت' از مولانا مودودی' ص ۴۰' ۱۹۶۸ء)

۳) "طلاق کی شرح سب سے زیادہ ان خاندانوں میں ہے جن میں شادی کا نتیجہ اولاد سے محرومی اور بچوں کی تعداد میں کمی ہے۔"

معاشی نقصان

"ضبط تولید سے ملک کی معیشت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ ملک میں بچوں اور نوجوانوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور بوڑھوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے' جس سے کام کرنے والے گھٹتے جاتے ہیں اور خرچ کرنے والے بڑھتے جاتے ہیں۔ ملکی صنعت کا بڑا حصہ بچوں اور نوجوانوں کی رنگارنگ ضروریات پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہ حصہ یا تو

ختم ہو جاتا ہے یا کم ہو جاتا ہے جس سے صنعتوں میں کمی واقع ہو کر بے کاری پیدا ہو جاتی ہے اور قوم میں کمانے والے مزید کم ہو جاتے ہیں۔ قوم میں بے کاروں اور بوڑھوں کی کثرت سے، قوم میں امنگوں اور امیدوں کے بجائے قنوطیت اور یاس کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ طبّی اخراجات میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے (بوڑھوں پر طبّی اخراجات زیادہ ہوتے ہیں)۔ اس کے علاوہ ضبطِ تولید کے نتیجہ میں گوناگوں بیماریوں کا شکار ہونے والی خواتین اور بچوں کو اضافی طبّی سہولت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان عوامل کے علاوہ کثرتِ آبادی کے سیاسی فوائد سے وہ قوم محروم ہو جاتی ہے کیونکہ عالمی سیاست میں کثیر آبادی کے حامل ملک کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ جب جارحانہ صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کے بجائے ہر معاملہ میں مداہنت سے کام لینے والے بوڑھے آجاتے ہیں تو وہ قوم سیاسی اور معاشی میدان میں پیچھے رہ جاتی ہے اور وہ قوم آگے نکل جاتی ہے جس میں جنگی صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کے علاوہ معاشی میدانوں میں کام کرنے والے اور جفاکش نوجوانوں کی پوری کھیپ ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جن ملکوں نے ضبطِ تولید پر عمل کیا ہے ان کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے جو تجزیہ کیا ہے، اس کے مطابق انگریز، فرانسیسی اور جرمن افراد کی تعداد برابر کم ہو رہی ہے اور اس کمی کی وجہ سے ان اقوام پر کم مہذب اقوام کی بالادستی قائم ہو رہی ہے۔"

Prnicíples of Social Reconstruction
Bertrand Russel 1951 'p 145

(بحوالہ "اسلام اور ضبط ولادت" از مولانا مودودی)

انٹرنیٹ کی سہولت رکھنے والوں کے لئے E-mail اور
Web page کا ایڈریس
E-mail : anjuman@brain.net.pk
URL. http://www.tanzeem.org

پیکرِ رحمت ﷺ کا غصہ

قاری ظہیر احمد عباسی، کوہ مری

جانِ دو عالم ﷺ کی ہستی دنیا کی وہ واحد ہستی ہے کہ جس کی حیاتِ طاہرہ کا کوئی گوشہ، کوئی پہلو اقوامِ عالم کی نگاہوں سے پنہاں نہیں ہے اور پنہاں ہو تا بھی کیسے جبکہ ربِّ کائنات نے اپنی آخری کتاب قرآن مجید میں اپنے آخری فرستادے محمد ﷺ کی پاکیزہ و مبارک زندگی کو حیاتِ انسانی کے لئے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" کے الفاظ میں کامل نمونہ قرار دیا۔ اور نمونہ بننے والی زندگی کے لئے یہ امر لازمی تھا کہ اس کا کوئی پہلو، کوئی دَور، کوئی گوشہ چھپا ہوا نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلان عام فرمایا ہوا تھا کہ خلوتوں اور جلوتوں میں مجھ سے جو دیکھو وہ بلا جھجک اور بے دھڑک دوسروں کو بیان کردو۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہر طبقہ انسانی کے لئے نمونہ ہے اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے اس زندگی کو ہی نمونہ یعنی اسوۂ حسنہ بننا تھا اس لئے ربِّ ذوالمنن نے اپنے قرآن کی طرح اس کی حفاظت کا بھی خوب بندوبست فرمایا۔ قرآن مجید کی حفاظت اپنے ذمے لی تو سیرتِ مصطفیٰؐ کی حفاظت کا کام اصحابِ مصطفیٰؐ کی مقدس جماعت سے لیا اور اب مسلمان ڈنکے کی چوٹ پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کسی کی زندگی ہمارے حضورؐ کی زندگی سے زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ حضورؐ کے ہر ہر فعل اور ادا کو جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔

سیرتِ مصطفوی ﷺ کے اسی امتیاز کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار کتب تصنیف ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس دن سیرتِ مصطفیٰؐ پر کوئی کتاب نہ لکھی جاتی ہو۔ سیرتِ مصطفیٰؐ کے ہزاروں پہلوؤں پر مستقل کتب تصنیف کی گئی ہیں اور یہ کام سیلِ رواں کی طرح جاری ہے اور "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" اور

"وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى" کی قرآنی پیشینگوئیاں اپنی صداقتیں منوا رہی ہیں۔ میں نے بھی ان سطور میں سرورِ عالم ﷺ کی حیاتِ طاہرہ کے ایک گوشے یعنی رحمتِ مجسمؐ کے غصے کے حوالے سے اپنی معروضات حوالۂ قرطاس کی ہیں۔

محمدؐ رحمۃ للعالمین

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ رسولِ رحمت ﷺ کی ذات فقط پیکرِ رحمت ہی تھی اور حضور کبھی غضبناک نہیں ہوئے ہوں گے۔ قرآن مجید نے صاحب قرآن کو "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" کے الفاظ میں جہانوں کے لئے رحمت قرار دیا ہے اور غصے میں آنا انسانی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے اور بلند اخلاق کی حامل شخصیت سے غصے کا صدور مستحسن نظر بھی نہیں آتا۔ خود حضور کا ایک فرمان اس کا مؤید ہے :

((عن ابی هريرة رضی اللّٰه عنه انَّ رسولَ اللّٰه صَلّیَ اللّٰه عليه وسلّم قال : لَيْسَ الشَّديدُ بِالصُّرَعةِ انَّما الشَّديدُ الّذی يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِندالغَضَبِ))

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں غالب آئے' پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے"۔

یہ درست ہے کہ حیوانی غصے کو کبھی بھی اچھا نہیں سمجھا گیا مگر بعض غصے ایسے ہوتے ہیں جن کے مقابلے میں ہزاروں شفقتیں اور رحمتیں ہیچ ہوتی ہیں۔ یہ محبت والے کے دل سے پوچھیں جس کا روٹھا ہوا محبوب راضی ہوتے ہوئے غصے ہوا ہو۔ یقیناً یہ غصہ اسے اپنے محبوب کی پرانی چاہتوں سے عزیز ہو گا۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انسانیت کی رشد و ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا اور ساتھ ہی اس کام کے کرنے کا انداز بھی یوں بتلا دیا گیا کہ "اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ" یعنی "لوگوں کو اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلاؤ" تو حضور نے فرمان خداوندی کی تعمیل میں حکمت سے

کام لیتے ہوئے کبھی شفقت سے اور کبھی مزاج مبارک کی برہمی سے لوگوں کو رب کی راہ دکھلائی ہے۔ محبوب لوگ اپنے چاہنے والوں سے کبھی غصہ دکھا کر اور کبھی مسکراہٹوں کے پھول برسا کر اپنی بات منوالیا کرتے ہیں۔ پس حضورؐ نے بھی تحریک اسلامی کے کارکنوں کی تربیت و اصلاح کی خاطر کبھی "موعظتِ حسنہ" اور کبھی "حکمت" کے پیش نظر غصے کا اظہار بھی فرمایا۔

حضورؐ اپنی ذات کے لئے غصہ نہیں فرماتے تھے بلکہ جب اپنی ذات کا معاملہ ہوتا تو حضور کی رحمت کی گہرائیوں کے سامنے سمندر بھی قطرہ لگتا۔ صفوان بن امیہ الجمعی نے کیا کیا اذیتیں نہ دیں مگر حضور نے اسے امان کی نشانی کے طور پر نبوت والا عمامہ عنایت کر دیا۔ اِس امت کے فرعون' اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل کا بیٹا عکرمہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر یمن چلا جاتا ہے' اس کی مسلمان بیوی حکیم بنت الحارث بن ہشام کی التجا پر اسے بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ کاتبِ وحی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مرتد ہو گئے تھے اور حضرت عثمانؓ نے جب ان کی سفارش کی تو ان کو بھی معاف فرما دیا۔ صاحبزادی زینبؓ کے قاتل ہبار بن الاَسود کا خون مباح کر دیا جاتا ہے' مگر حاضر خدمت ہو کر جب وہ توبہ کرتا اور معافی مانگتا ہے تو معاف کر دیا جاتا ہے (حضرت محمد ﷺ' از علی اصغر چوہدری) چچا کے قاتل وحشی بن حرب اور چچا کی لاش کا مثلہ بنانے والی ہند زوجہ ابو سفیان کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ کعب بن زہیر جیسا زہر اگلنے والا شاعر جس نے زندگی کا بیشتر حصہ آپؐ کی ہجو گوئی میں گزارا' حاضر خدمت ہو کر قصیدہ بانت سعاد پیش کرتا ہے تو حضورؐ اسے اپنی چادر انعام میں دے دیتے ہیں اور اسے بھی معاف کر دیتے ہیں۔ تو حضور اپنے لئے غصہ نہیں فرماتے تھے بلکہ یہ کبھی تو دشمنانِ خدا و رسول پر ہوا ہے اور کبھی تربیت و اصلاح کی خاطر کارکنانِ تحریک اسلامی پر ہوا۔ ایک دفعہ مسجد میں تشریف لائے تو مسجد کی دیواروں پر تھوک کے دھبے اور نشانات دیکھے۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپ نے اس شاخ سے ان دھبوں کو کھرچا اور مسجد کی دیواروں کو کراہت والے اُن دھبوں سے پاک کر دیا' اور پھر لوگوں سے خطاب کر کے غصے میں فرمایا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کوئی شخص تمہارے سامنے آ کر تمہارے چہرے پر تھوک دے۔ جب کوئی

شخص نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اور فرشتے اس کے دائیں ہوتے ہیں' اس لئے سامنے اور دائیں نہیں تھوکنا چاہئے۔ (ترغیب و ترہیب' سیرۃ النبیؐ)

راستوں میں گندگی پھیلانے پر

عربوں کی ایک عادتِ بد یہ بھی تھی کہ راستوں میں بے تکلف بول و براز کرتے تھے۔ حضورؐ ایسا دیکھتے تو سخت غصے اور برہمی کا اظہار فرماتے۔ چنانچہ آپ نے راستوں میں اور درختوں کے سائے میں پیشاب کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے (ترغیب و ترہیب) لعنت کا مطلب ہے رحمت سے دُوری۔ دیکھا آپ نے رحمتِ مجسم ﷺ کا غصہ!

بدبودار اشیاء پر

بدبودار چیزوں مثلاً پیاز اور لہسن وغیرہ سے نفرت تھی' اس لئے حکم تھا کہ جو شخص پیاز یا لہسن کھائے وہ ہماری مسجد میں نہ آئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ حکومت میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ تم لوگ پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر آتا تو آپ حکم دیتے کہ اسے مسجد سے نکال کر بقیع پہنچا دیا جائے۔

نا مرغوب رنگ پر

حضورؐ کو سفید رنگ بہت پسند تھا اور سرخ رنگ سے نفرت تھی۔ بسا اوقات سرخ رنگ پر غصے اور برہمی کا اظہار بھی فرمایا۔ ایک روز ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر حاضرِ خدمت ہوا اور سلام عرض کیا مگر آپ نے جواب نہیں دیا۔ ایک مرتبہ صحابہؓ نے سواری کے جانوروں پر سرخ چادریں ڈال دیں تھیں تو آپؐ نے فرمایا : میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ سرخی تم پہ غالب آجائے۔ عبداللہ بن عمروؓ سرخ رنگ کے کپڑے پہن کر حاضرِ خدمت ہوئے تو فرمایا : یہ کیا لباس ہے؟ عبداللہ نے جا کر آگ میں ڈال دیا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا : کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔ (ابوداؤد' سیرۃ النبیؐ' سید سلیمان ندوی)

خفیف سوالات پر

دورِ جاہلیت کے پروردہ لوگ بسا اوقات ایسے سوالات کرتے کہ آپؐ کو غصہ آجاتا اور شدید ناگواری ہوتی۔ مثلاً کوئی پوچھتا یا رسول اللہ میرے باپ کا کیا نام ہے؟ میرا اونٹ گم ہوگیا ہے وہ کہاں ہے؟ ایک مرتبہ اسی قسم کے سوالات کئے گئے تو آپ نے برہم ہوکر فرمایا : جو پوچھنا ہو پوچھو' میں سب کا جواب دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرۂ اقدس کے رنگ کو دیکھا تو الحاح کے ساتھ عرض کیا رَضِیتُ الخ (بخاری کتاب العلم' سیرۃ النبیؐ' جلد دوم)

غلاموں کی حمایت میں

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی : "اے ابو مسعود جان لو!" غصے کی وجہ سے میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ کون کہہ رہا ہے۔ جب وہ شخص قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت محمد ﷺ ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ "جان لو اے ابو مسعود تم کو جتنی قدرت اس غلام پر ہے اس سے زیادہ قدرت اللہ کو تم پر ہے"۔ میں نے عرض کیا اب کبھی بھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا اور ساتھ ہی اس غلام کو آزاد کر دیا۔ ابو مسعود نے غصے میں بید ردی سے اسے پیٹا تھا اور وہ بھی کوڑے سے۔ اس لئے یتیموں کے والی کو غصہ آگیا' ابو مسعود کو سختی سے ٹوکا اور فرمایا : "اگر تم نے اسے آزاد نہ کیا ہوتا تو جہنم کی لپٹ تم تک پہنچتی"۔ ("زادراہ" ص ۳۴۲ از مولانا جلیل حسن ندوی)

نوحہ کرنے پر

اسلام صبر و رضا کا دین ہے اور اپنے پیروؤں سے راحتوں میں شکر اور مصائب میں صبر کا تقاضا کرتا ہے' اس لئے آپؐ کو بے صبری اور ناشکری سخت ناپسند تھی۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؓ جن سے آپ بہت زیادہ محبت کرتے تھے جب ان کی شہادت پر بے صبری کا مظاہرہ کیا گیا تو آپ شدید برہم ہوئے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں روایت ہے کہ نوحہ کرنے والی عورتوں کے متعلق آپ کو خبر دی گئی تو آپ نے منع کرنے کا حکم دیا۔ منع کرنے والا

ناکام آیا تو آپؐ نے دوسری بار اسے پھر بھیجا' اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو تیسری مرتبہ آپؐ نے فرمایا: "جا کر ان عورتوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔" اسی طرح ام سلمہؓ نے بھی اپنے شوہر کے انتقال پر گریہ وبکا کی کوشش کی تو حضورؐ نے فرمایا: "کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو جس سے خدا نے اسے نکال دیا ہے۔" (صحیح مسلم' صفحہ ۳۴)

حکام کی بے احتیاطی پر

کسی بھی معاشرے کو کھوکھلا کرنا ہو تو وہاں رشوت کو رواج دے دو' پورے معاشرے کی عمارت شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گی۔ عدل و انصاف کا خون ہو گا اور نفس پرستی و مادیت پرستی عام ہو کر روحانیت کا خاتمہ کر دے گی۔ حضور ﷺ کے دور کے معاشرے میں رشوت لینے دینے کی مثالیں تو نہیں ملتیں لیکن اس کے باوجود حضور کو جہاں شبہ ہو جاتا وہاں سخت تنبیہ فرماتے۔ بڑے افسروں کو رشوت نقد کی بجائے تحائف کی صورت میں دی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور کے دور میں بھی پیش آیا جب آپ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو زکوۃ کی وصولی کے لئے بھیجا تو اس نے واپس آکر حضورؐ کے سامنے زکوۃ کا مال پیش کیا اور کہا: "اتنا مال مسلمانوں کا ہے اور اتنا مجھے ہدیہ ملا ہے۔" یہ چونکہ ایسا فعل تھا کہ اگر اس کی سرعام مذمت نہ کی جاتی تو لوگ اس کو ہمیشہ کے لئے جواز بنا لیتے' اس لئے آپؐ نے منبر پر خطبہ دیا اور فرمایا: "اس عامل کو دیکھو جو یہ کہتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے اور یہ میرا مال ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے کہ اس کے پاس تحفہ آتا ہے یا نہیں؟" (صحیح مسلم شریف)

دھوکہ دہی پر

دھوکے باز کی معاشرے میں کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عام اخلاقی درس دیا کہ "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ" (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) اس لئے حضور کو دھوکہ دہی سے سخت نفرت ہوتی تھی۔ دھوکہ دہی کے سدِباب کے لئے آپ نے شدید برہمی کا اظہار بھی فرمایا۔ چنانچہ فرمایا "مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا" جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں ــــــ ایک بار بازار میں تشریف لئے گئے تو ایک شخص کے غلے کے ڈھیر میں

ہاتھ ڈال کر دیکھا تو نمی محسوس ہوئی۔ چونکہ بھیگے ہوئے غلے کا وزن بڑھ جاتا ہے اس لئے آپ نے فرمایا: "جو دھوکہ دیتا ہے وہ ہم میں سے نہیں"۔ ("سیرت سید المرسلین" از مولانا ابوالکلام آزاد) الفاظ کے زیر و بم پر غور کیجئے کہاں رحمت مجسم اور کہاں اتنی سخت سزا کہ "وہ ہم میں سے ہی نہیں"۔

بے حیائی کے مظاہرے پر

حیا انسان کا زیور ہے اور بے حیا کا کوئی وقار نہیں۔ حضور ﷺ خود کسی کنواری دوشیزہ سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ آپؐ نے اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ کہہ کر حیاء کو ایمان کا حصہ بنا دیا ہے۔ بے حیائی پر آپؐ سخت غصے میں بھی آئے۔ ایک بار آپؐ نے ایک شخص کو میدان میں بالکل برہنہ نہاتے دیکھا تو فوراً منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا "اللہ تعالیٰ حیاء کو پسند کرتا ہے' اس لئے برہنہ نہ ہوا کرو"۔ ("سیرت سید المرسلین" از ابوالکلام آزاد)

ایک مرتبہ آنحضورؐ زکوٰۃ کے اونٹوں کی چراگاہ میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ چرواہا جنگل میں ننگا لیٹا ہے۔ آپ نے اسی وقت اسے معزول کر دیا اور فرمایا: "لَا یَعْمَلُ لَنَا مَنْ لَّا حَیَاءَ لَہٗ" یعنی جس میں حیا نہیں وہ شخص ہمارے کسی کام کا نہیں ("پردہ" صفحہ ۲۸۲' از سید ابوالاعلیٰ مودودی)۔ اور آپؐ کے ارشاد "اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ" میں جو ناگواری' برہمی' غصے اور بے زاری کی فراوانی ہے وہ الفاظ ہی سے عیاں ہے۔

آلاتِ تکبّر پر

اللہ تعالیٰ کو تکبر سخت ناپسند ہے' بروزِ حشر متکبرین سے کہا جائے گا: اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَکَبِّرِیْنَ۔ تکبر صرف اللہ تعالیٰ کو ہی زیب دیتا ہے۔ جب کبھی ایسا موقع آتا کہ نبی ﷺ کے دل میں تکبر پیدا ہونے کا سامان ہوتا تو آپؐ سختی سے انکار کر دیتے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے منقش کپڑے کا پردہ لٹکایا' حضورؐ کی نظر پڑی تو فوراً اتروا دیا۔ ایک صحابی نے حریر کا چغہ آپؐ

کو پیش کیا' آپؐ نے اسے پہن کر نماز پڑھی' نماز سے فراغت کے بعد نہایت ناگواری کے ساتھ اتار کر پھینک دیا اور فرمایا : لَایَنْبَغِیْ هٰذَا لِلْمُتَّقِیْنَ "یہ پرہیزگاروں کے قابل نہیں" (سیرت سید المرسلین)

لایعنی بحثوں پر

حضورؐ نے مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان فرمائی کہ وہ لایعنی اور غیر ضروری مباحث میں نہیں پڑتا۔ ان میں بعض تو فقط وقت کے ضیاع کا سبب ہوتی ہیں مگر بعض بحثیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان میں غور و فکر سے روکا نہ جائے تو مذہبی عقائد میں بہت سے فتنوں کے دروازے کھل جائیں اور ایسے لوگوں کی آپؐ نے پہلے ہی خبر بھی دے دی تھی کہ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ اَقْوَامٌ یُکَذِّبُوْنَ بِالْقَدَرِ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو قدر کا انکار کریں گے (حاکم) ("تاریخ حدیث" از ڈاکٹر غلام جیلانی برق' صفحہ نمبر ۱۰۵)

ایک مرتبہ صحابہ اسی مسئلۂ قدر و جبر پر مباحثہ کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ لیا تو چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا : هٰذَا اُمِرْتُمْ اَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ تَضْرِبُوْنَ الْقُرْآنَ بَعْضَهٗ بِبَعْضٍ' هَلَكَتِ الْاُمَمُ قَبْلَكُمْ (سیرت سید المرسلین)

نمازِ باجماعت سے عدم شمولیت پر

اسلام نے نماز کی ادائیگی کے لئے جماعت کو ضروری قرار دیا ہے اور جماعت والی نماز کو اکیلی نماز پر ۲۷ درجہ فضیلت بخشی ہے اور حضورؐ فرماتے ہیں کہ دنیا میں اجنبی چار ہیں : ظالم کے سینے میں قرآن' بے نمازوں کے محلے میں مسجد' تلاوت نہ کرنے والوں کے گھر قرآن مجید' اور بری قوم میں نیک آدمی ("تاریخ حدیث" از غلام جیلانی برق' صفحہ ۱۷۸) تحریک اسلامی کے رکن کی حیثیت سے ہر کارکن کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ جماعتی نظم کی خاطر اور تحریکی اہداف کے حصول اور مقاصد کی تکمیل کے لئے نماز پنجگانہ باجماعت مسجد میں ادا کرے' لیکن بعض لوگ اس سے غفلت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ

نے چند افراد کو ڈھونڈا' نہ پایا تو اس پر نہایت برہم ہوئے اور فرمایا : " جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بنا کر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر ان کے گھروں میں آگ پھونک دوں" (صحیح مسلم' سیرت سید المرسلین) دیکھا آپ نے کہاں رحمتِ مجسم کی رحمتوں کے چھم چھم برستے بادل اور کہاں اتنا غصہ کہ گھر تک جلا ڈالنے کی خواہش؟ یہ غصہ اپنی ذات کے لئے نہ تھا بلکہ کارکنان تحریکِ اسلامی کی تربیت و اصلاح کے لئے تھا۔

مقتدیوں کی رعایت نہ کرنے والے امام پر

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ امام صاحبان جب نماز پڑھاتے ہیں تو مقتدا ہونے کے اثر سے آواز میں خاص تصنّع کا اہتمام کرتے ہیں اور نماز قدرے لمبی کر دیتے ہیں۔ آپ ؐ کی تاکید تھی کہ امام جب نماز پڑھائے تو مختصر پڑھائے اور جب خود پڑھے تو جتنی مرضی ہو لمبی پڑھے۔ خود رحمتِ مجسم ﷺ مقتدیوں کا بہت خیال رکھا کرتے تھے دوران نماز کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو ماں کی بے قراری کے خیال سے نماز مختصر فرما دیتے۔ اسی طرح ضعیف اور کاروباری لوگوں کی مجبوری کا بھی خیال رکھا کرتے تھے۔ اگر کوئی امام لمبی نماز پڑھاتا تو سرزنش فرماتے۔ ایک شخص نے آپ کی خدمت میں اپنے امام سے متعلق یہی شکایت کی تو آپ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا اور فرمایا : " تم دین سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہو؟ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہئے کیونکہ ان میں مریض' ضعیف اور کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں" (بخاری شریف' سیرت سید المرسلین' رسولِ عربی)

اپنے سرداروں کے وقار کی خاطر

جو قوم اپنے سرداروں کا ادب و احترام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اپنے سرداروں کے وقار کو خود گرا دیتی ہے اس کے سردار اور بالآخر وہ قوم خود بھی بے وقعت و بے وقار ہو جایا کرتی ہے۔ حضور ؐ اپنے مقرر فرمودہ سرداروں کے وقار کا خوب خیال فرمایا کرتے تھے اور کبھی اس کے منافی کوئی عمل دیکھتے تو سخت غصہ فرماتے اور سرداروں کے وقار کو بحال فرما دیتے۔ غزوۂ موتہ ۸ ہجری کا واقعہ ہے کہ حضور ؐ نے زید ابن حارثہ کو سردارِ لشکر بنایا

اور فرمایا : اگر زید شہید ہوں تو جعفر طیار سردار ہوں گے اور اگر جعفر بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے۔ اتفاق کی بات کہ تینوں شہید ہو گئے تو مسلمانوں نے تاریخ اسلامی کے عظیم جرنیل نامور سپاہی خالد بن ولید کو امیر لشکر بنا لیا اور آپ کے ہاتھ سے اس روز ۸ تلواریں اور بعض روایات کے مطابق ۹ تلواریں ٹوٹیں۔ حضرت عوف ابن مالک روایت کرتے ہیں کہ قبیلہ حمیر کے ایک شخص نے دشمنوں میں سے ایک دشمن کو مارا اور اس کا سامان لینا چاہا تو خالد بن ولید نے نہ دیا تو عوف بن مالک رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے یہ حال بیان کیا۔ آپ نے خالدؓ سے فرمایا : تم نے اس کو سامان کیوں نہ دیا؟ خالد نے عرض کی : یا رسول اللہؐ وہ سامان بہت تھا۔ آپؐ نے فرمایا : اس کو دے دو۔ پھر خالد عوف کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے چادر کھینچی اور کہا : جو میں نے بیان کیا تھا رسول اللہؐ سے وہی ہوا نا؟ (یعنی خالد کو شرمندہ کر دیا) فَسَمِعَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاسْتَغْضَبَ فَقَالَ : لَا تُعْطِهٖ يَا خَالِدُ لَا تُعْطِهٖ يَا خَالِدُ "تو جب رسول اللہ ﷺ نے یہ سنا تو غصہ ہوئے اور فرمایا اے خالد اس کو مت دے، اے خالد اس کو مت دے" (پھر فرمایا) هَلْ اَنْتُمْ تَارِكُوْنَ لِيْ اُمَرَاءِيْ "کیا تم میرے (مقرر کردہ) سرداروں کو چھوڑنے والے ہو؟" (مسلم شریف، کتاب الجہاد والسیر)

الغرض رسول اللہ ﷺ نے اراکین تحریک اسلامی کی تربیت و اصلاح کے لئے برہمی اور غصے کا اظہار بھی فرمایا ہے اور یہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے نہ تھا بلکہ اس میں بھی انسانیت کی بھلائی اور ہدایت ہی پیش نظر رہتی تھی۔ فرماتے تھے کہ میری مثال ایسی ہے کہ تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر جہنم سے ہٹاتا ہوں اور تم ہو کہ جہنم ہی کی طرف دوڑے جاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ سیرتِ مصطفویؐ کی روشنی سے اپنی زندگیوں کو اجلا بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

عصری مسائل کا حل
سیرتِ طیبہ کی روشنی میں

ممتاز احمد اعوان ☆

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نسل انسانی کے لئے نمونہ کامل کا درجہ رکھتی ہے۔ آپؐ کی ذات گرامی ایک آفتاب ہے جو انسانیت کو منور کرتا ہے۔ آپؐ کی ذات بابرکات ایک بحر بیکراں ہے جو ہر طالب حق کو گوہر ہائے مطلوب سے نوازتی ہے۔ مومن ہر لحظہ آپؐ کے نمونہ کامل کا محتاج ہے۔ آپؐ نے زندگی کی ہر جہت میں ایک نمونہ پیش فرمایا۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی معرفت کے نقطہ عروج پر فائز ہوتے ہوئے مادی زندگی کی تنظیم و ترتیب اس انداز سے فرمائی کہ پوری زندگی میں اطاعت الٰہی کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ آپؐ کی ذاتِ کامل ہر دور کے ارتقائی مراحل میں انسان کے لئے ہر طرح کی راہنمائی مہیا کرتی ہے۔ انسان اس وقت اضطراب میں مبتلا ہے۔ روحانی طور پر ہم مضطرب ہیں، ذہن تفکرات میں گھرا ہوا ہے۔ اس اضطراب کے نتیجے میں بے یقینی اور عدم توازن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارا عصر حاضر کی کربناک کیفیت کے بارے میں یہ سمجھ لینا کہ یہ اطمینان بخش ہے محض خود فریبی ہے۔ عصر حاضر کے مسائل کا حل تلاش کرنا اور اس صورتحال سے نکلنا ہمارا قومی فریضہ اور اپنے روحانی روگ کو دور کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ انسان اپنے تخلیقی افعال و کردار کے اعتبار سے بھی اور روحانی پہلو سے بھی ترقی پذیر ہے۔ اس ارتقاء کے نقطہ عروج تک پہنچنے کے لئے نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہی وہ واحد ہستی ہے جو نمونہ کامل کا کردار ادا کر سکتی ہے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیات اس بات پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

☆ اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج پیپلز کالونی گوجرانوالہ

اطاعت میں ہی ہر دور کے مسائل کا حل مضمر ہے اور ان سے فرار و احتراز گمراہی و ضلالت کی صورت میں منتج ہو گا۔

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر۳۶ میں فرمایا :

﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾

"جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہ ہوا۔"

یہ مضمون دیگر کئی مقامات پر بھی بیان ہوا ہے۔ {۱}

سورۃ النساء کی آیت نمبر۶۵ میں بڑے فیصلہ کن انداز سے بتا دیا گیا ہے کہ ہمارے ایمان کو پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ ہم اپنے معاملات زندگی میں نبی کریم ﷺ کے احکام کو واجب التعمیل مانتے ہیں یا نہیں۔

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾

"تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے معاملات میں آپؐ کو منصف تسلیم نہ کریں اور جو فیصلہ آپؐ کریں اس پر دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس فیصلہ کے سامنے مکمل طور پر سرِ تسلیم خم کر دیں۔"

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے کہ :

i) اپنے معاملات میں نبی کریم ﷺ کو منصف ماننا ہمارے ایمان کی پہچان اور تقاضا ہے۔

ii) یہ فیصلہ مانتے ہوئے ماتھے پر شکنیں نہ پڑیں بلکہ خوش دلی سے مانیں۔

iii) یہ فیصلہ مکمل طور پر مانا جائے، کچھ مان لیا کچھ چھوڑ دیا کی کیفیت نہ ہو۔

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر۶ {۲} اور سورۃ التوبہ کی آیت نمبر۱۲۸ {۳} کو یکجا کر کے پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھا رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی مومنوں کی اتنی خیر خواہ ہے کہ کسی انسان کا اپنا کوئی فیصلہ یا منصوبہ کسی بھی وجہ سے

اس کے خلاف جا سکتا ہے اور اس سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کی ذات وہ ہے جن کا کوئی حکم یا فیصلہ کسی بھی مومن کے لئے تکلیف یا نقصان کا باعث نہیں بن سکتا۔ لہٰذا تم اپنے معاملات میں بے چون و چرا انہیں ہی منصف مانا کرو اور انہی کی ہدایات پر عمل کیا کرو۔

مذکورہ صدر دونوں آیات میں اس بات کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب تمہارے اس قدر خیر خواہ ہیں تو تمہاری محبت کا مرکز بھی وہی ہونے چاہئیں۔ اس طرح "محبت بھری اطاعت" کا سبق دیا گیا کیونکہ جو اطاعت محبت کی معیت میں ہو وہ آسان بھی ہوتی ہے اور دیرپا بھی۔

سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ میں نبی کریم ﷺ کے کچھ امتیازات بیان کئے گئے کہ آپؐ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے اور گندی چیزوں کو حرام فرماتے ہیں اور انسانوں نے خود ساختہ پابندیوں کے جو طوق اپنے اوپر اٹھا رکھے تھے انہیں ہٹاتے ہیں۔ ان چیزوں کے ذکر کے بعد فرمایا :

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

"پس جو لوگ آپؐ پر ایمان لاتے ہیں، آپؐ کی حمایت کرتے ہیں، آپؐ کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کی اتباع کرتے ہیں جو آپؐ کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔"

گویا اس آیت مبارکہ میں کامیابی کی ضمانت نبی کریم ﷺ کی اطاعت میں رکھی گئی ہے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۷۱ میں فرمایا :

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

"جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی وہ یقیناً بڑی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔"

اس کے علاوہ متعدد آیات میں نبی کریم ﷺ کی اطاعت کو لازم بھی کیا گیا اور اسی میں کامیابی کا راز بتایا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

(i) ((تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي)) {۴}

"میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' تم اگر انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ یعنی اللہ کی کتاب اور میری سنت۔"

(ii) ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي)) {۵}

"تمہارے اوپر لازم ہے کہ میری سنت پر عمل کرو۔"

(iii) ((لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ)) {۶}

"تم میں سے کوئی شخص کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہشات کو اس چیز کے تابع نہ کر لے جو میں لے کر آیا ہوں۔"

(iv) ابو رافع سے روایت ہے' فرمایا : "میں تمہیں ایسا نہ پاؤں کہ ایک شخص اپنے چھپر کھٹ میں تکیہ لگائے (مغرورانہ انداز سے) بیٹھا ہو اور میرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جن سے منع کیا ہے' کوئی حکم اس کے پاس پہنچے اور اسے سن کر وہ کہہ دے کہ میں کچھ نہیں جانتا' ہم تو اسی کی اطاعت کریں گے جو ہمیں کتاب اللہ میں ملا ہے"۔ {۷}

لاتعداد احادیث میں سے نمونے کے طور پر ہم نے چند احادیث کا ذکر کیا ہے جن میں نبی کریم ﷺ کی اتباع کو کامیابی کی ضمانت قرار دیا گیا ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم عصر حاضر کے مسائل اور سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ان کے حل پر روشنی ڈالیں گے۔

i) علاقائی' لسانی اور نسلی تعصبات :

اسلامی معاشرہ اس وقت جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک مسئلہ تعصبات اور محدود عصبیتوں کا مسئلہ ہے۔ اس فتنے نے معاشرہ کو گھن کی طرح کھوکھلا کر دیا ہے۔ ان علاقائی' لسانی اور نسلی تعصبات نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ مسلمانوں میں باہم تفرقہ ڈالنے کے لئے مسلمان ممالک میں نظریہ قومیت کو اجاگر کیا گیا اور انہیں چھوٹی

چھوٹی قومیتوں میں تقسیم کرنے کی کامیاب حکمت عملی اختیار کی گئی ہے اور ہم اپنے دشمنوں کے جال میں پھنس کر ان محدود قومیتوں کے راگ الاپ رہے ہیں۔ کم و بیش ہر مسلمان ملک میں ایسا ہی کھیل کھیلا گیا ہے' حالانکہ نبی کریم ﷺ نے انہی رجحانات کا قلع قمع فرمایا تھا۔ وہ عرب جو اپنی عصبیت میں شدید تھے' آپؐ نے انہیں ایک نئی ترکیب سے شیر و شکر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا احسان عظیم بتایا ہے کہ اس نے تمہاری دشمنیوں کو اخوت میں بدل دیا اور افتراق و عداوت کے حوالے سے بتایا کہ تم تباہی کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے لیکن اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا {۸}۔ پھر قرآن مجید کا اعلان ہے کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں جو محبت ڈالی اس کے حصول کے لئے اگر تم اپنا سب کچھ خرچ کر دیتے تب بھی اسے حاصل نہ کر پاتے {۹}۔ منافقین نے اوس اور خزرج کے درمیان شرارت سے جھگڑا پیدا کیا تو اسی وقت قرآن مجید میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ" وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ {۱۰} نبی کریم ﷺ نے تمام علاقائی' لسانی اور خاندانی تعصبات کا استیصال فرما دیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے :

"جو شخص امام کی اطاعت سے نکل گیا اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گیا اور اسی حال میں فوت ہوا' تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔ اور جو شخص ایسے نشان کے نیچے لڑا جس کا حق یا باطل ہونا معلوم نہ ہو اور وہ تعصب سے غضبناک ہوا اور اس نے لوگوں کو اسی تعصب کی بنیاد پر بلایا' اور اگر کسی کی مدد کی تو وہ بھی تعصب کی بنیاد پر کی اور وہ اسی حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ میری امت کے خلاف جو تلوار لے کر کھڑا ہوا اور میری امت کے اچھے اور برے لوگوں کو قتل کیا' نہ اپنے معاشرے کے مومن کی پروا کی اور نہ ہی ایسے کافر کی جس کا مسلمانوں کے ساتھ امن کا معاہدہ تھا' ایسا شخص مجھ سے نہیں ہے اور نہ میں اس سے ہوں۔ نہ تو وہ میری امت میں سے ہے اور نہ ہی میں اس کا ذمہ دار ہوں۔" {۱۱}

مسلم شریف میں روایت ہے' عرفجہؓ کہتے ہیں :

سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ : ((إِنَّهُ

سَتکون هنات وهنات، فمَن اراد اَن یفرّقَ امرَ هذہِ الامّۃ وھی جمیعٌ فاضربُوہ بالسّیفِ کائنًا مَن کان)) [۱۲]

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "عنقریب طرح طرح کے شر اور فسادات رونما ہوں گے۔ پس جو شخص اس امت کے اتحاد و ارتباط میں تفریق پیدا کرے اور متحد قوم کے اتحاد کا شیرازہ بکھیرے، اس کی گردن تلوار سے اڑا دو، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔"

وحدتِ ملت کے شیرازہ کو متحد رکھنے کی اہمیت اس حد تک ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حق المقدور سربراہِ مملکت کی اطاعت کا ہی حکم دیا ہے اور بات بات پر اختلاف و انتشار پیدا کرنے کے رجحان کی شدید طور پر حوصلہ شکنی کی ہے [۱۳]۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے نسب پر فخر کرنے کی ممانعت کرتے ہوئے فرمایا:

((لَینتھینَّ اقوامٌ یفتخرون بآباءِ ھم الّذین ماتوا، انّما ھم فحمُ من جھنّم، او لیکونُنَّ اھونَ علی اللّٰہ مِنَ الجُعَلِ الذی یُدَھْدِہُ الخِراءَ بِاَنفہ، اِنَّ اللّٰہ قد اَذْھَبَ عنکم عُبِیّۃَ الجاھلیۃِ وفَخرھا بالآباء، انّما ھو مومنٌ تقیٌّ، اَو فاجرٌ شقیٌّ، النّاس کلُّھم بنو آدم، وآدمُ مِن تُراب)) [۱۴]

"لوگ اپنے ان آباء و اجداد پر فخر کرنے سے لازماً باز رہیں جو مر چکے ہیں، وہ تو جہنم کے کوئلے ہیں۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نجاست کے اس کیڑے سے بھی ذلیل تر ہو جائیں گے جو نجاست کو اپنی ناک سے آگے دھکیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آباء و اجداد پر فخر کرنے کی علت کو ختم کر دیا ہے۔ اب یا تو متقی مومن ہے یا فاجر بدبخت وبدکار۔ تمام آدمی آدم کے بیٹے ہیں اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔"

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ہم حق یا ناحق کی پروا کیے بغیر محض خاندان اور قبیلے کی جانبداری کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فتنہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جو شخص ناحق اپنی قوم کی حمایت کرے وہ اس اونٹ کی مانند ہے جو کنوئیں میں گر پڑے اور اسے دم سے پکڑ کر نکالا جائے۔" {۱۵}

واثلہ بن اسقع سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ "میں نے عرض لیا: یارسول اللہ (ﷺ) عصبیتِ جاہلیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

"عصبیت یہ ہے کہ تو ظلم پر اپنی قوم کی حمایت کرے۔" {۱۶}

نبی ﷺ نے فرمایا کہ قوم سے محبت مذموم نہیں لیکن گناہ میں اس کا ساتھ دینا جرم ہے۔ یعنی قوم کسی ایسے کام میں مبتلا ہو جو ظلم پر مبنی ہو اور ہم اسے ظلم سے منع کرنے کی بجائے اس کی مدد کرنے لگیں تو یہ عصبیتِ جاہلیت ہے۔ سراقہ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا:

"تم میں بہتر شخص وہ ہے جو اپنی قوم کی طرف سے ظلم کی مدافعت کرے جب تک کہ وہ اس مدافعت میں گناہ کا مرتکب نہ ہو۔"

گویا نبی کریم ﷺ نے قوم کا ساتھ دینے کی حد یہاں بیان فرمادی ہے کہ یہ مدد صرف اسی حد تک ہو کہ قوم ظلم کی مرتکب نہ ہو رہی ہو۔ اسی طرح کی ایک روایت مسند احمد اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔

جبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيسَ مِنّا مَن دعا الى العَصبيةِ' وليس مِنّا مَن قاتل عصبيةً' وليس مِنّا مَن مات علىٰ عصبيةٍ)) {۱۷}

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے لوگوں کو عصبیت کی دعوت دی۔ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی عصبیت کی بنیاد پر کسی سے جنگ کرے اور وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی حالت میں مرا۔"

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تمہارے نسب کوئی ایسی چیز نہیں کہ تم ان کے سبب کسی کو برا کہو۔ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ سیر کے برابر سیر (یعنی برابر وزن کے) کسی کو کسی پر فضلت نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کی بنیاد پر۔" {۱۸}

(جاری ہے)

(اس قسط کے حواشی اگلی قسط کے ساتھ ملاحظہ فرمائیے)

امام ابنِ ماجہ رح

(۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ)

(گرشتہ سے پیوستہ)

عبدالرشید عراقی

سنن ابن ماجہ

امام ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی کارنامہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "سنن ابن ماجہ" ہے۔ اسی کتاب کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اس کی ترتیب فقہی طرز پر ہے اور یہ ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور ۴ ہزار احادیث پر مشتمل ہے {۲۱}۔

سنن ابن ماجہ کی خصوصیات

سنن ابن ماجہ اسلامیات کی عظیم ترین اور احادیث کی امہات کتب میں شامل ہے۔

حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) فرماتے ہیں کہ :

"یہ کتاب نہایت مفید ہے، اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اس کی ترتیب و تبویب ہے اور اس کے مطالعہ سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے۔" {۲۲}

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں کہ :

وکتابہٗ فی السنن جامع جیّد {۲۳}

"ان کی کتاب سنن (احکام) میں ایک عمدہ جامع ہے"۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) فرماتے ہیں :

وفی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار واختصار آنچہ ایں کتاب دارد، ہیچ یک از کتب ندارد۔ {۲۴}

"فی الحقیقت وہ احادیث کو بلا تکرار بیان کرتے ہیں اور حسن ترتیب و اختصار کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کی ہمسر نہیں ہے"۔

سنن ابن ماجہ کی اس عظمت و اہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے۔ حافظ ابو زرعہ رازی (م ۲۶۴ھ) جن کے بارے میں علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں :

"امام ابو زرعہ رازی حفظ حدیث' ذکاوت' دینداری' اور علم و عمل کے لحاظ سے ان لوگوں میں سے تھے جو یکتائے زمانہ ہوئے"۔{۲۵}

انہوں نے سنن ابن ماجہ کو دیکھ کر یہ سند عطا فرمائی تھی کہ :

"اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور تصنیفات بے کار اور معطل ہو کر رہ جائیں گی"۔{۲۶}

حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اپنی تاریخ "البدایہ والنہایہ" میں لکھتے ہیں :

سنن ابن ماجہ سنن و احکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے"۔{۲۷}

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں :

"اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس وصف میں وہ دوسری کتب احادیث سے منفرد و ممتاز ہے"۔{۲۸}

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟

سنن ابن ماجہ جمہور علمائے کرام کے نزدیک صحاح ستہ میں شامل ہے اور بعض علمائے کرام اس کی بجائے موطا امام مالک اور سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کرتے ہیں۔ لیکن جمہور علمائے کرام کی رائے کے مطابق سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے۔ اور اس کا درجہ سب سے آخر میں ہے یعنی :

(۱) صحیح بخاری (۲) صحیح مسلم (۳) سنن ابی داؤد (۴) جامع ترمذی (۵) سنن نسائی (۶) سنن ابن ماجہ۔ سنن ابن ماجہ کے صحاح ستہ میں شامل ہونے یا نہ ہونے پر علامہ حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی (م ۵۱۷ھ)' حافظ امام عبدالغنی مقدسی

(م ۶۰۰ھ)، شیخ ابن صلاح (م ۶۴۲ھ)، امام نووی (م ۶۷۶ھ)، حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) اور محی السنہ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) نے کافی بحث کی ہے، جو ان کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے {۲۹}۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے تذکرہ المحدثین میں موطا امام مالک اور سنن دارمی کو صحاح ستہ میں شامل کرنے پر بہت عمدہ اور جامع تبصرہ فرمایا ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی لکھتے ہیں :

"اہل مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی موطا ہے اور سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں موطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔ لیکن جہاں تک موطا کی صحت و جودت اور اہمیت و عظمت کا سوال ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ وہ حدیث کی طرح فقہ و آثار اور فتاویٰ صحابہ و تابعین سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، موقوف، مرسل، و مسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس کی موجودہ شکل و صورت میں اس کا حدیث کی مروج و متداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کا جو مقام و مرتبہ ہے اس میں حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علماء نے صحیحین پر اس کو فوقیت دی ہے۔ خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع و مسانید سے بڑھ کر ہے (تدریب الراوی صفحہ ۳۶) اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا بھی یہی خیال ہے۔ محی السنہ مولانا نواب صدیق خان صاحب فرماتے ہیں :

"شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جو ان کے ہمنوا ہیں، حدیث و فقہ میں صحیح ترین کتاب موطا امام مالک ہے۔ پھر بخاری پھر مسلم۔ شاہ ولی اللہ نے شرح موطا یعنی مصفی (فارسی) کے شروع میں روئے زمین کی تمام کتابوں پر موطا کو ترجیح کے مسئلہ میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے"۔ (مسلک المحتام ص ۱۸)

سنن ابن ماجہ کو موطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے، جو بہت سی زائد حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہو گئی ہے، ورنہ صحت و قوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا

سکتی۔

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیلی علائی (م ۷۶۱ھ) ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر روایتیں بہت کم ہیں۔ اس لئے سنن ابن ماجہ کی بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے۔ بہرحال سنن دارمی کو خواہ صحت و قوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تنہا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ علائی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔" {۳۰}

شروح و تعلیقات

سنن ابن ماجہ کے ساتھ علمائے کرام نے بڑا اعتنا کیا ہے' اس کے متعدد حواشی و شروح لکھے جن کی تعداد سنن نسائی سے زیادہ ہے۔

(۱) شرح سنن ابن ماجہ : امام علاؤالدین مغلطائی (م ۷۶۲) (نامکمل)

(۲) ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ : علامہ شیخ سراج الدین علی بن ملقن (م ۸۰۴ھ)

(۳) شرح سنن ابن ماجہ : علامہ ابن رجب حنبلی (م ۷۹۵ھ)

(۴) الدیباجۃ فی شرح سنن ابن ماجہ : شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری (م ۸۰۸ھ)

(۵) مصباح الزجاجۃ (حاشیہ) : علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ)

(۶) شرح سنن ابن ماجہ (حاشیہ) : علامہ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی (م ۱۳۸ھ)

(۷) انجاح الحاجۃ شرح سنن ابن ماجہ (تعلیق) : شیخ عبدالغنی بن ابی سعید مجددی (م ۱۲۹۵ھ)

(۸) مفتاح الحاجۃ (حاشیہ) : علامہ شیخ محمد علوی (م ۱۳۶۶ھ)

(۹) رفع العجاجة عن ترجمة سنن ابن ماجه : (اردو شرح) مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۳۸ھ)[۳۱]

(۱۰) شرح سنن ابن ماجه (عربی) : شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز

مختصر تعارف شرح سنن ابن ماجہ

مولانا محمد علی جانباز (شیخ الحدیث جامعہ ابراہیمہ سیالکوٹ) نے شیخ الحدیث مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (م ۱۴۰۸ھ) کی تحریک پر ۱۹۸۵ء میں سنن ابن ماجہ کی شرح لکھنی شروع کی۔ سنن ابن ماجہ میں احادیث کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس وقت تک ۳۲۰۰ احادیث کی شرح مکمل کر چکے ہیں۔ اور یہ شرح ان شاء اللہ العزیز ۸ جلدوں میں مکمل ہو گی۔ اس وقت ۶ جلدیں تیار ہیں۔ پہلی جلد میں انہوں نے امام ابن ماجہ کے حالات زندگی، راویان سنن ابن ماجہ کے حالات اور حجیت حدیث، تدوین حدیث، کتابت حدیث پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے موضوعات جن کا تعلق حدیث سے ہے ان پر بھی بڑی علمی و تحقیقی اور جامع گفتگو کی ہے۔ اس شرح کی پہلی دو جلدیں ان شاء اللہ العزیز اسی سال کے دوران شائع ہو جائیں گی۔

حواشی

(۲۱) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۲۱۰، شاہ عبد العزیز دہلوی، بستان المحدثین ص ۱۱۲

(۲۲) ابن کثیر، الباعث الحثیث ص ۹۰ (۲۳) ابن حجر، تہذیب التہذیب، ج ۹، ص ۵۳۱

(۲۴) شاہ عبد العزیز دہلوی، بستان المحدثین ص ۱۲۵ (۲۵) ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۲، ص ۳۰

(۲۶) شاہ عبد العزیز دہلوی، بستان المحدثین ص ۱۲۵ (۲۷) ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۱۱ ص ۵۲

(۲۸) ضیاء الدین اصلاحی، تذکرہ المحدثین، ج ۱ ص ۲۷۳

(۲۹) محمد بن طاہر مقدسی، شروط الائمہ الستہ، ص ۹، سیوطی، تدریب الراوی، ص ۳۰، نواب صدیق حسن خان، الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ، ص ۱۱۰

(۳۰) ضیاء الدین اصلاحی، تذکرہ المحدثین، ج ۱ ص ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸

(۳۱) ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۸۱، ۲۸۲

سُوْرَةُ البَقَرَةِ

آیات ۱۰۲ - ۱۰۳

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کیلئے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغہ 'الاعراب 'الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغہ کیلئے ۱' الاعراب کیلئے ۲' الرسم کیلئے ۳' اور الضبط کیلئے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لئے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لئے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغہ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھٰکذا۔

۲ : ۶۲ : ۲ الاعراب

ترکیب نحوی کے لئے اِس عبارت کو ۱۳ جملوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اسی لئے ہر نحوی جملے کے آخر پر کوئی نہ کوئی علامت وقف دی گئی ہے۔

① وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ

[وَ] عاطفہ ہے جو اگلے فعل [اتبعوا] کو سابقہ آیت کے صیغہ فعل (نبذ) پر عطف کرتی ہے

[اتبعوا] فعل ماضی معروف جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر الفاعلین "ھم" موجود ہے۔

[ما] موصولہ ہے جو یہاں فعل "اتبعوا" کا مفعول ہے' یا یوں کہئے کہ یہاں (اسم موصول) سے یہ مفعول شروع ہوتا ہے جسے محلاً منصوب کہا جائے گا۔ [تتلو] فعل مضارع معروف صیغہ

واحد مؤنث غائب ہے جو فاعل [الشَیاطِینُ] کے جمع مکسر آنے کی وجہ سے آیا ہے اور بیانِ قصہ کی بناء پر یہاں یہ بمعنی "تَلَتْ" (صیغہ ماضی مؤنث غائب) کے لئے آیا ہے۔ [علٰی مُلکِ سلیمٰن] علٰی حرف الجر یہاں بمعنی "فِی" آیا ہے اور "مُلْکِ سُلَیْمٰن" مضاف (مُلکُ) اور مضاف الیہ (سُلیمان) مل کر مجرور ہیں اور اس سے پہلے لفظ "زَمَن" محذوف ہے جو "فِی" سے سمجھا جا سکتا ہے۔ "مُلْکِ" تو یہاں مجرور بالجر ہے (علٰی کی وجہ سے) اور آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بھی ہے اور اس میں علامت جر آخری "کِ" کی کسرہ (ـــِــ) رہ گئی ہے "سلیمان" غیر منصرف ہے' اس لئے اس میں جر (جو بالاضافہ ہے) کی علامت "ن" کی فتحہ ہے۔ سلیمان کا غیر منصرف ہونا عجمیت اور علمیت کی بنا پر ہے یعنی وہ ایک غیر عربی نام ہے۔

۲ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِینَ کَفَرُوا یُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ

[وَ] کو مستانفہ بھی کہہ سکتے ہیں اور اس میں حالیہ (بمعنی حالانکہ) ہونے کی گنجائش بھی ہے۔

[مَا کَفَرَ] فعل ماضی معروف واحد مذکر غائب منفی ہے اور یہ نفی "مَا" نافیہ کے ذریعے واقع ہوئی ہے۔ [سلیمان] اس منفی فعل (ما کفر) کا فاعل لہٰذا مرفوع ہے۔ [وَلٰکِنَّ] واو العطف ہے اور "لٰکِنَّ" حرف مشبہ بالفعل ہے جس کا اسم منصوب [الشَّیاطِینَ] ہے جو جمع سالم نہیں بلکہ جمع مکسر ہے اور [کَفَرُوا] فعل ماضی معروف جملہ فعلیہ بن کر "لٰکِنَّ" کی خبر لہٰذا محلاً مرفوع ہے۔ [یُعَلِّمُونَ] فعل مضارع معروف ہے ضمیر الفاعلین "ھُمْ" ہے جس کی علامت صیغہ فعل کی واو الجمع (ـــُـو) ہے۔ [النَّاسَ] اس فعل (یُعَلِّمُونَ) کا پہلا مفعول (لہٰذا منصوب) ہے۔ علامت نصب "سَ" کی فتحہ (ـــَــ) ہے۔ [السِحرَ] اس فعل کا دوسرا مفعول منصوب ہے جس کی علامت "رَ" کی فتحہ (ـــَــ) ہے۔ اور یہ پورا جملہ فعلیہ (یُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ) سابقہ فعل "کَفَرُوا" کی ضمیر الفاعلین کا حال بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی "اُنہوں نے کفر کیا اس حالت میں کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے" یا اس جملہ کو "الشَّیاطِینَ" (اسمِ لٰکِنَّ) کی خبر ثانی کہہ سکتے ہیں' یعنی "کفر بھی کیا اور تعلیم سحر کا کام بھی کیا۔"

۳ وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوتَ وَمَارُوتَ۔

[وَ] برائے عطف ہے اور [مَا] موصولہ ہے جو واو عاطفہ کے ذریعے "السحر" پر معطوف ہے یعنی "جادو" بھی سکھاتے تھے اور وہ بھی جو...... " گویا یہ "مَا" (اپنے مابعد صلہ سمیت)

فعل "یُعَلِّمُوْنَ" کا ہی ایک اور مفعول ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے سابقہ جملے کے "مَا تَتْلُوْ" پر عطف سمجھا جائے ـ اِس صورت میں یہ فعل "وَاتَّبَعُوْا" (اوپر جملہ نمبر۱ والا) کا مفعول ثانی بن سکتا ہے۔ یعنی وہ پیچھے لگ گئے اس کے جو شیاطین پڑھتے تھے اور اس کے بھی جو ..... (بابل میں) اُتارا گیا۔ جیساکہ آگے آرہا ہے)۔ اُردو مترجمین نے دونوں طرح ترجمہ کیا ہے یعنی مندرجہ بالا پہلی ترکیب کے مطابق بھی اور دوسری ترکیب کے مطابق بھی۔ بلکہ زیادہ تر نے دوسری ترکیب کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے۔ [اُنْزِلَ] فعل ماضی مجہول واحد مذکر غائب ہے جس میں نائب الفاعل ضمیر "هُوَ" مندرجہ بالا "مَا" موصولہ کے لئے ہے۔ [عَلَى الْمَلَكَيْنِ] میں علامتِ جر آخری نون سے ماقبل والی "یاء" ماقبل مفتوح (ـَـ ىْ) ہے جو تثنیہ میں استعمال ہوتی ہے۔ [بِبَابِلَ] حرف الجر (بِ) اور مجرور (بابلَ) کو بھی "اُنْزِلَ" سے متعلق سمجھا جاسکتا ہے اور معناً اسے "المَلَكَيْن" کا حال بھی کہہ سکتے ہیں۔ لفظ "بابل" بھی عجمی علم ہونے کے باعث غیر منصرف ہے اس لئے اس میں علامت جر آخری "لَ" کی فتحہ (ـَـ) ہے [هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ] دونوں بذریعہ واو العطف مل کر "المَلَكَيْن" کا بدل ہے لہٰذا مجرور ہیں۔ یہ بھی عجمی نام ہیں اس لئے غیر منصرف ہیں اور علامت جر ان میں آخری "ت" کی فتحہ (ـَـ) ہے۔

● بعض نحویوں نے ---- اور ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے بھی اس جملے کے ابتدائی "مَا" کو موصولہ کی بجائے "نافیہ" قرار دیا ہے۔ اس صورت میں "مَا اُنْزِلَ" کا ترجمہ ہوگا "اور وہ نہیں اُتارا گیا تھا" (بابل میں دو فرشتوں پر) گویا یہ ہاروت ماروت کا قصہ ایک یہودی افسانہ ہے جس کی قرآن نے تردید کردی ---- اس جملے کی حد تک تو یہ نحوی توجیہ قابل قبول ہو سکتی ہے مگر اس کے بعد آنے والے جملوں میں یہ عبارت کسی طرح فٹ نہیں آتی۔ اسی لئے اہل علم کی اکثریت نے یہاں "مَا" کو موصولہ ہی قرار دیا ہے۔

۴ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ۔

[وَ] یہاں استیناف کے لئے ہے یعنی ایک الگ بات یا قصے کا دوسرا پہلو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ [مَا] نافیہ ہے اور اس کی تائید آگے "حتّٰی" کے استعمال سے ہوتی ہے۔ [يُعَلِّمٰنِ] (اس کے قرآنی رسم پر آگے بات ہوگی) فعل مضارع معروف صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے جس میں ضمیر الفاعلین "هُمَا" "المَلَكَيْن" کے لئے ہے۔ [مِنْ اَحَدٍ] یہ دراصل تو "اَحَدًا" تھا جو فعل "يُعَلِّمَان" کا ایک مفعول تھا (دوسرا مفعول یہاں محذوف ہے) پھر اس نکرہ

"اَحَدًا" (کسی ایک کو) پر عموم نکرہ کی قطعیت کے لئے "مِنْ" آیا ہے۔ اب یہ جار مجرور مل کر مفعول ہیں اور محلاً نصب میں ہیں اور اسی لئے ترجمہ "کسی ایک کو بھی" ہو گا۔ [حَتّٰی] یہاں "اِلٰی اَنْ" (یہاں تک کہ) کے معنی میں ہے اور اسی لئے بعض نے یہاں "حَتّٰی" بمعنی "اِلَّا اَنْ" ہی لیا ہے (مثلاً العکبری نے) جب کہ بعض نے اسے غلط قرار دیا ہے (مثلاً الدرویش نے) بلکہ اسے حرفِ غایت (یہاں تک کہ 'جب تک کہ 'اس وقت تک جب کہ) ہی سمجھا ہے۔ ویسے اس بحث سے عبارت کے اصل مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ [یَقُوْلَا] فعل مضارع منصوب بوجہ "حتّٰی" ہے۔ علامتِ نصب آخری "ن" (یقولان کا)گرنا ہے اور اس صیغہ تثنیہ کی ضمیر فاعل "ھما" بھی "الملَکَین" ہی کے لئے ہے۔ [اِنَّمَا] کی "مَا" کافہ اور "اِنَّ" مکفوفہ ہے یعنی "مَا" نے "اِنَّ" کا عمل روک دیا ہے اور اس میں حصر کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ [نَحْنُ] ضمیر مرفوع منفصل مبتدأ ہے اور [فِتْنَةٌ] اس کی خبر ہے جو نکرہ بھی ہے اور مرفوع بھی۔ [فَلَا تَكْفُرْ] فاء (فَ) یہاں فصیحہ ہے جو بغیر شرط کے جوابِ شرط کا مفہوم دیتی ہے۔ اُردو ترجمہ اس کا بہرحال "سو" یا "پس" ہی ہو گا۔ "لَا تَكْفُرْ" فعل نہی صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور یہ پورا جملہ (اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ) اوپر والے فعل "یَقُوْلَا" کا مقول (مفعول) ہو کر ایک طرح سے محلِ نصب میں ہے اور یہاں "اسے سیکھ کر" کے معنی کا ایک فعل محذوف ہے جو عبارت سے سمجھا جاتا ہے۔

۵ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ

[فاء۔ ف] کو یہاں مستانفہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔ [يَتَعَلَّمُوْنَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "هُمْ" ہے۔ [مِنْهُمَا] جار مجرور مل کر متعلق فعل (يَتَعَلَّمُوْنَ) ہیں۔ [مَا] موصولہ ہے فعل (يَتَعَلَّمُوْنَ) کا مفعول لہٰذا محلاً منصوب ہے بلکہ دراصل تو "مَا" کے بعد آنے والا صلہ بھی ساتھ مل کر مفعول بنے گا۔ [يُفَرِّقُوْنَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "هُمْ" ہے اور [بِهٖ] جار مجرور مل کر اس فعل (يُفَرِّقُوْنَ) سے متعلق ہیں۔ [بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ] میں "بَيْنَ" تو ظرفِ منصوب ہے (جو ہمیشہ مضاف ہو کر ہی آتا ہے) اس کے بعد "الْمَرْء" اس ظرف کا مضاف الیہ مجرور ہے 'علامتِ جر آخری "ء" کی کسرہ (ـِـ) ہے کیونکہ یہ معرف باللام بھی ہے۔ اس کے بعد "وَ" کے ذریعے بعد والے لفظ (زَوْجِهٖ) کو اس (الْمَرْء) پر عطف کیا گیا ہے۔ "زَوْجِهٖ" جو خود مرکب اضافی ہے 'کا پہلا جزء "زَوْج" یہاں مجرور پر عطف کی بناء پر مجرور ہے اور آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہو گیا ہے۔ دراصل یہاں "زَوْجِهٖ" سے پہلے بھی ایک "بَيْنَ" محذوف ہے یعنی "بَيْنَ الْمَرْءِ وَبَيْنَ

زَوْجِہٖ" ہونا چاہئے تھا مگر جب دو اسم ظاہر "بَیْنَ" کے مضاف الیہ ہوں تو "بَیْنَ" کی تکرار نہیں کی جاتی۔ اور یہ پورا جملہ (یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ) "مَا" موصولہ کا صلہ ہے اور پھر یہ سارا صلہ موصول مل کر فعل "یَتَعَلَّمُوْنَ" کا مفعول بنتا ہے۔

⑥ وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ

[وَ] کو یہاں حالیہ ہی سمجھا جا سکتا ہے بمعنی "حالانکہ" [مَا] نافیہ حجازیہ ہے (جس کی خبر پر باء الجر آتی ہے)۔ [هُمْ] اس (مَا) کا اسم مرفوع ہے اور [بِضَارِّيْنَ] میں باء الجر زائدہ ہے (ان معنی میں کہ اس کے بغیر بھی "ضَارِّيْنَ" خبر منصوب ہو سکتی تھی مگر اس "بِ" سے معنی میں ایک زور پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ محض بیکار نہیں ہے) اور یہ "بِضَارِّيْنَ" جار مجرور مل کر "مَا" کی خبر ہے جو محلاً نصب میں ہی ہے۔ [بِهٖ] جار مجرور مل کر متعلق خبر (ضَارِّيْنَ) ہیں۔ [مِنْ اَحَدٍ] میں بھی دراصل تو "اَحَدًا" اسم الفاعل "ضَارِّيْنَ" کا مفعول ہو کر نصب میں تھا مگر اس پر "مِنْ" لگا کر اس کے عموم نکرہ میں قطعیت پیدا کی گئی ہے یعنی کسی "ایک ایک کو بھی" یوں یہ "مِنْ اَحَدٍ" مفعول ہو کر (لفظاً مجرور مگر) محلاً منصوب ہے کیونکہ اسم الفاعل (جیسا کہ "ضَارِّيْنَ" ہے) بھی فعل کا سا عمل کرتا ہے۔ [اِلَّا] حرف استثناء ہے جو نفی کے بعد آنے سے "اداۃِ حصر" بن گیا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ "مگر صرف" ہوگا۔ [بِاِذْنِ اللّٰهِ] باء الجر کے بعد مضاف "اِذْن" اور مضاف الیہ "اللّٰہ" مل کر مرکب اضافی اس (باء) کی وجہ سے مجرور ہے۔ اور یہ حصۂ عبارت "اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" بلحاظ معنیٰ "ضَارِّيْنَ" (فاعل) یا "مِنْ اَحَدٍ" (مفعول) دونوں کا حال سمجھا گیا ہے یعنی یہ نقصان اور ضرر پہنچانا" یا "پہنچنا" اسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ اللہ کا اذن و حکم ساتھ شامل ہو یعنی مقدر عبارت "اِلَّا مَقْرُوْنًا بِاِذْنِ اللّٰهِ" بنتی ہے۔

⑦ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

[وَ] عاطفہ ہے۔ [يَتَعَلَّمُوْنَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "هُمْ" ہے اور یہ سابقہ "يَتَعَلَّمُوْنَ" پر ہی عطف ہے۔ [مَا] موصولہ "يَتَعَلَّمُوْنَ" کا مفعول بہ محلاً منصوب ہے۔ [يَضُرُّهُمْ] میں "يَضُرُّ" فعل مضارع معروف صیغہ واحد غائب مذکر ہے جس کی ضمیر فاعل "هُوَ" مَا موصولہ کے لئے ہے اور "هُمْ" ضمیر منصوب فعل "يَضُرُّ" کا مفعول بہ ہے اور یہ جملہ "يَضُرُّهُمْ" "مَا" کا صلہ ہے۔ اس کے بعد پھر [وَ] عاطفہ ہے اور [لَا يَنْفَعُهُمْ] میں "لَا يَنْفَعُ" تو فعل مضارع معروف منفی بلا مع ضمیر الفاعل "هُوَ" ہے اور اس کے آخر پر بھی "هم" ضمیر منصوب مفعول بہ ہے اور یہ جملہ (لَا يَنْفَعُهُمْ) بھی بذریعہ واو

العطف "مَا" کا صلہ ہی بنتا ہے اور یہ صلہ موصول (مَا یضرُّھم وَلا ینفعُھم) مل کر فعل "یتعلَّمُون" کا مفعول بہ لہٰذا محلاً منصوب ہے۔

⑧ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ

[وَ] یہاں مستانفہ ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس عبارت کے شروع اور آخر میں وقفِ مطلق کی علامت (ط) ڈالی گئی ہے۔ [لَقَدْ] لامِ تاکید اور حرفِ تحقیق "قَدْ" کا مجموعہ ہے۔ [عَلِمُوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "ھُمْ" ہے اور [لَمَنِ] کی ابتدائی لام مفتوحہ لام الابتداء ہے (جو مبتدا پر آتی ہے اور تاکید کے معنی پیدا کرتی ہے) اور "مَنْ" یہاں اسم الموصول مبتدا ہے اور یہ شرطیہ بھی ہے۔ [اشترٰہ] فعل ماضی معروف واحد مذکر غائب (اشترٰی) کے ساتھ ضمیر منصوب (ہُ) مفعول بہ ہے۔ [مَا] نافیہ حجازیہ ہے۔ [لَہٗ] جار (ل) اور مجرور (ہ) مل کر اس "مَا" کی خبر (قائم مقام خبر) کا کام دے رہا ہے جو اس کے اسم سے مقدم آئی ہے۔ [فِی الاخرۃِ] جار (ف) اور مجرور (الاخرہ) مل کر متعلق خبر یا لحاظ معنی حال کا قائم مقام سمجھا جا سکتا ہے (یعنی اس حالت میں کہ وہ آخرت میں ہو گا کے مفہوم کی صورت میں)۔ [مِنْ خَلَاقٍ] "مِنْ" جارہ زائدہ ہے اور "خَلَاق" نکرہ مجرور "بِمَنْ" ہے جس سے "خَلَاقٍ" (کچھ حصہ) کے عموم نکرہ میں مزید قطعیت آتی ہے۔ یعنی کچھ حصے میں سے بھی نہیں ہو گا۔ یہاں دراصل لفظ "خَلَاقٌ" مرفوع تھا کیونکہ وہ "مَا" کا اسم یا مبتدا مؤخر تھا (جب خبر جار مجرور یا ظرف مضاف کی صورت میں مقدم آئے۔ جیسے یہاں "لَہٗ" ہے تو مبتدا مؤخر نکرہ ہو کر آتا ہے)۔ یہاں اگر جملہ منفی نہ ہوتا تو بنیادی عبارت ہوتی "لہ خَلَاقٌ" (اس کے لئے کچھ حصہ ہے) جیسے کہیں "لہ ابنٌ" اس کا ایک بیٹا ہے' پھر شروع میں "ما" لگنے سے جملہ منفی ہوا۔ یعنی "مالہ خلاقٌ" بنا (اس کا کوئی حصہ نہیں ہے) پھر اس میں مبتدا مؤخر سے پہلے "فی الآخرۃِ" کا اضافہ ہوا۔ یہ بعد میں بھی آسکتا تھا مگر اس تقدیم سے اس میں زور پیدا ہوا ہے یعنی "آخرت میں ہی" تو اس کا کچھ حصہ نہ ہو گا اور "خَلَاق" کو مزید قطعی نکرہ بنانے کے لئے "مِن" لگا۔ یوں اس (مِن خَلَاقٍ) کا ترجمہ ہوا "کچھ بھی حصہ"۔ اس طرح یہ "مِنْ خَلَاقٍ" "مَا" کا اسم ہونے کی بناء پر محلاً مرفوع ہے اور یہ جملہ (لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ) اس لحاظ سے محلاً مرفوع ہے کہ یہ دراصل ابتدائی فعل "عَلِمُوا" کے دونوں مفعولوں کا قائم مقام ہے۔ (فعل "عَلِمَ" کے بعض دفعہ دو مفعول بھی آتے ہیں۔ دیکھئے الممتحنہ: ۱۰ میں ہے "اِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ مُؤْمِنٰتٍ") یعنی "انہوں نے جان لیا اس کے خریدار کو محرومِ آخرت" کے مفہوم کے ساتھ یہ عبارت فعل "عَلِمُوا" کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

⑨ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ

[وَ] عاطفہ ہے اور [لَبِئْسَ] کی ابتدائی لام مفتوحہ تاکید کے لئے آتی ہے اور "بِئْسَ" فعلِ ذم ہے جو جامد فعل ہے۔ [مَا] کو موصولہ سمجھیں تو یہ "بِئْسَ" کا فاعل مرفوع ہے یا اسے نکرہ تامہ (بمعنی شَیْئًا) لیں تو اسے فعلِ ذم کی تمیز منصوب بھی سمجھ سکتے ہیں (نحوی افعال مدح وذم کی دونوں طرح ترکیب کرتے ہیں۔ دیکھئے البقرہ: ۹ [۲: ۵۵: ۲] میں "بِئْسَمَا" کے اعراب کی بحث) اور یہ فعل اور فاعل (لَبِئْسَ مَا) مل کر آگے آنے والے مبتدأ (مخصوص بالذّم) کی خبر مقدم بنتی ہے۔ [شَرَوْا] فعل ماضی معروف مع ضمیر الفاعلین "هُمْ" ہے۔ [بِهٖ] جار مجرور متعلق فعل "شَرَوْا" اور [اَنْفُسَهُمْ] مضاف (اَنْفُس) اور مضاف الیہ (هُم) مل کر فعل "شَرَوْا" کا مفعول بہ ہے۔ اسی لئے "اَنْفُسَ" نصب میں ہے جس کی علامت "سَ" کی فتحہ (ـَـ) ہے اس طرح یہ جملہ (شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ) مخصوص بالذم ہو کر مبتدأ ہے جس کی خبر مقدم جملہ فعلیہ "بِئْسَ مَا" ہے۔

⑩ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

[لَوْ] شرطیہ (بمعنی اگر) بھی ہو سکتا ہے اور حرفِ تمنی (بمعنی کاش کہ) بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ کوئی عمل نہیں کرتا یعنی شرطیہ ہوتے ہوئے بھی جزم نہیں دیتا۔ [كَانُوا] فعل ناقص صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں اسم كَانَ "هُمْ" شامل ہے۔ [يَعْلَمُونَ] فعل مضارع معروف مع ضمیر الفاعلین "هُمْ" جملہ فعلیہ بن کر "كَانُوا" کی خبر ہے۔ گویا "لَوْ كَانُوا عَالِمِينَ" کے مفہوم میں ہے۔ "لَوْ" کو "تمنّی" کے لئے سمجھیں تو یہ جملہ مکمل ہے۔ اگر "لَوْ" کو شرطیہ سمجھا جائے تو جوابِ شرط محذوف ہے مثلاً "لَمَّا فَعَلُوْهُ" (تو وہ ایسا نہ کرتے)

⑪ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ

[وَ] یہاں استیناف کی ہے اور [لَوْ] یہاں شرطیہ ہی ہے جسے بعض نحوی "حرفُ امتناعٍ لِامتناعٍ" بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں کسی ایسی شرط کا بیان ہوتا ہے جس کا وجود نہیں (یعنی پائی نہ گئی) اس لئے اس کا جواب بھی ممتنع (ناقابلِ حصول) ہے۔ یعنی چونکہ شرط ممتنع (غیر موجود ہے) تو جوابِ شرط بھی ممتنع (غیر ممکن) ہوتا ہے۔ [اَنَّهُمْ] یہ حرفِ مشبہ بالفعل (اَنَّ) اور اس کا اسم (ضمیر منصوب "هُمْ") ہے مگر چونکہ "لَوْ" شرطیہ جملہ اسمیہ پر داخل نہیں ہوتا اس کے بعد کوئی فعل ہی آنا چاہئے اس لئے نحوی اس "اَنَّهُمْ" کو ایک محذوف فعل (ثَبَتَ = ثابت ہو جانا) کے ہم معنی سمجھتے ہیں اور پھر اس (اَنَّهُمْ) کے بعد بصورت خبر آنے والے فعل کو مصدر مؤول

(بطورِ مصدر) اس محذوف فعل (ثَبَتَ) کا فاعل سمجھتے ہیں مثلاً یہاں اس "اَنَّھُمْ" کی خبر ماضی کے دو صیغہ فعل [آمَنُوا وَاتَّقَوْا] آئے ہیں اب یا تو یہ سیدھا شرطیہ جملہ "لَوْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا" ہوتا تو ٹھیک تھا کہ "لَوْ" کے بعد فعل ہی آتا ہے لیکن اب "لَوْ" کے بعد "اَنَّھُمْ" آنے کی وجہ سے (جو جملہ اسمیہ کی ابتداء ہے) ان دونوں صیغہ ہائے فعل کے مصدر مؤوّل اس محذوف فعل کے فاعل مرفوع سمجھے جائیں گے۔ گویا یہ عبارت اب دراصل "لَوْ ثَبَتَ اِیمَانُھُم وتَقوٰ ھُم" سمجھی جائے گی یعنی اگر ان کا "ایمان اور تقویٰ ثابت ہوتا" یہ الجھن صرف اس لئے پیدا ہوئی کہ "لَوْ" کے بعد جملہ فعلیہ ہی آتا ہے اگر جملہ اسمیہ آجائے تو نحوی حضرات اسے کھینچ تان کر (ایک محذوف فعل کے ذریعے ہی سہی) جملہ فعلیہ بنا لیتے ہیں۔ اُردو میں اس "اَنَّھُمْ" کے "اَنَّ" (کہ بے شک) کا ترجمہ نہ کرنے کی یہی وجہ ہے۔ کیونکہ "لَوْ" (اگر) کے ساتھ (بے شک) لگنے کا کوئی تُک نہیں بنتا۔ اسی لئے نحوی اس "اَنَّ" کو فعل "ثَبَتَ" کے معنی میں لیتے ہیں کہ "ثابت" اور "بے شک" ایک طرح سے ہم معنی ہیں۔ [لَمَثُوْبَةٌ] کے شروع میں لام الابتداء ہے جو بعض دفعہ بغرض تاکید مبتدأ پر بھی لگتی ہے اور یہ جوابِ شرط (لَوْ) میں آنے والی لامِ مفتوحہ بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے عموماً جواب لَوْ میں آنے والے لام مفتوحہ کے بعد بھی جملہ فعلیہ ہی آتا ہے۔ اس لئے اسے لام الابتداء سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔ "مَثُوْبَةٌ" یہاں مبتدأ مرفوع ہے اور اس کے نکرہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر صفت موصوف (مرکب توصیفی) نکرہ آئے تو اس میں مبتدأ بننے کی صلاحیت ہوتی ہے (جیسے لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ) (البقرہ :۲۲۱ میں ہے) یہاں بھی [مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ] پورا مرکب جاری (مِن جارہ + عند ظرف مضاف + اللہ مضاف الیہ) مل کر "مَثُوْبَةٌ" نکرہ موصوف کی صفت کا کام دے رہا ہے، یعنی "وہ ثواب جو اللہ کے ہاں سے ملتا تو وہ" کا مفہوم رکھتا ہے۔ [خَيْرٌ] اس (مَثُوْبَةٌ) کی خبر مرفوع ہے۔

⑫ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

یہی جملہ اُوپر نمبر ۱۰ میں گزرا ہے۔

۲ : ۶۲ : ۳ الرسم

زیرِ مطالعہ آیات میں بلحاظ رسمِ قرآنی کل گیارہ کلمات قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں سے چار کلمات کا رسم مختلف فیہ ہے اور سات کا متفق علیہ۔ یہ گیارہ کلمات حسب ذیل ہیں۔ تتلوا' الشیٰطین' سلیمٰن' لٰکن' ھاروت' ماروت' یعلّمٰن' اشترٰہ' الاخرة'

خَلَاق اور لَبِئس مَا۔

تفصیل یوں ہے :

① "تَتۡلُوا" : اس صیغہ فعل کی عام املاء "تَتۡلُوۡ" (واو کے بعد الف کے بغیر) ہے تاہم مصاحف میں اس کے آخر پر ایک زائد الف لکھا جاتا ہے (تَتۡلُوا) اصل مصاحفِ عثمانی کے رسم میں متعدد کلمات میں الف زائدہ لکھا گیا تھا جن کا ذکر کتب الرسم میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اِن میں سے بعض "زیادات" کو کسی قاعدے (عموم) کے تحت بھی بیان کیا گیا ہے۔ {١} (یا یوں کہئے کہ مصاحفِ عثمانی کے رسم سے یہ قاعدے اخذ کئے گئے) تاہم زیادہ تر "الف" کی یہ زیادتی کسی قاعدہ قانون کے تحت نہیں بلکہ "نقل صحیح" کی بناء پر اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ مثلاً رسم عثمانی میں ہر واو متطرفہ (آخر پر آنے والی واو) کے آخر پر عموماً ایک زائد الف لکھا گیا تھا چاہے وہ کوئی اسم مضاف ہو یا صیغہ فعل۔ مثلاً اولوا' بنوا' مرسلوا یا آمنوا' لاتفسدوا' وغیرہ۔ بعد میں جب عربی املاء کو نحویوں نے ترقی دی اور اس کے قواعد بنائے تو اس قسم کا زائد الف صرف واو الجمع والے صیغہ فعل کے لئے ضروری قرار دیا گیا باقی کلمات میں جہاں واو متطرفہ آئے وہاں اس کا لکھنا غلط قرار دیا گیا' تاہم قرآنِ کریم کی املاء نحوی قواعد املاء کے تحت نہیں بلکہ نقل اور روایت کے تحت اختیار کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی املاء میں یہ واو الجمع (فعل) کے بعد الف زائدہ کا قاعدہ چلتا ہے۔ مثلاً اسی قطعہ میں سات افعال (اتبعوا' کفروا' شروا' کانوا' آمنوا' اتقوا اور علموا) کے ساتھ آخر پر واو کے بعد الف زائدہ لکھا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس قاعدہ کے خلاف (یا اس سے مستثنیٰ) چھ صیغہ افعال آئے ہیں۔ ان پر حسب موقع بات ہوگی۔ اب یہ صیغہ فعل "تَتۡلُوۡ" تو واحد کا صیغہ ہے اور اس کی "واو" واو الجمع نہیں بلکہ اصل مادہ کی "و" ہے (تَلَا یتلُو سے)۔ لہٰذا عام رسم املائی میں اس کے بعد زائد الف لکھنا غلط ہے مگر رسم عثمانی کے مطابق یہاں زائد الف لکھنا بالاتفاق ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں صیغہ فعل "یتلوا" (واحد مذکر) سات جگہ' "تَتۡلُوا" (صیغہ واحد مؤنث غائب یا مذکر حاضر) ۵ جگہ' "اَتۡلُوا" (واحد متکلم) دو جگہ اور "نَتۡلُوا" (جمع متکلم) ایک جگہ آیا ہے۔ ان تمام مقامات پر آخر میں الف زائدہ لکھا جاتا ہے۔ البتہ اگر ایسے صیغہ فعل کے ساتھ کوئی ضمیر منصوب (مفعول) آجائے تو پھر یہ الف نہیں لکھا جاتا۔

{١} مثلاً دیکھئے سمیر الطالبین للضباع' ص ۷۲۔ المقنع للدانی' ص ۴۲۔ العقیلہ' ص ۵۵ ببعد' دلیل الحیران للمارغنی' ص ۲۲۴۔ ۲۵۲۔ ونثر المرجان للارکاتی' ۱:۶۱ تا ۶۵۔

۲ "الشَّیٰطِین" : اس کی عام املاء "الشیَاطین" (باثبات الف بعد الیاء) ہے مگر قرآنِ کریم میں بالاتفاق اسے یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ مفرد مرکب صورتوں میں ۱۸ جگہ آیا ہے) بحذف الالف بعد الیاء (الشیٰطین) لکھا جاتا ہے تاہم یہ الف پڑھا جاتا ہے اس لئے بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے اسی آیت میں یہ لفظ دو بار آیا ہے۔

۳ "سلیمٰن" : اِس کی عام املاء "سُلَیمان" یعنی باثبات الف بعد المیم ہے مگر قران کریم میں اسے یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ کل ۱۷ جگہ آیا ہے دو دفعہ تو اسی آیت میں ہے) بالاتفاق بحذف الالف بعد المیم (بصورت "سلیمٰن") ہی لکھا جاتا ہے۔

۴ "لٰکِن" : مخففہ (لٰکِنْ) ہو یا مشدد ہ (لٰکِنَّ) قرآن کریم میں بلکہ عام عربی املاء میں بھی ہمیشہ "بحذف الالف بعد اللام" لکھا جاتا ہے (قیاس تو "لاکِن" چاہتا تھا) اور اس کا یہ رسم املائی بھی عربی املاء پر رسم قرآنی (عثمانی) کے اثرات کا مظہر ہے۔

۵ "هَارُوت" : یہ بھی ایک عجمی (غیر عربی) نام ہے۔ اس کے الف بعد الھاء کے حذف یا اثبات میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کی طرف منسوب قول حذف کے حق میں ہے جبکہ الدانی سے اثبات منقول ہے۔ چنانچہ بیشتر عرب اور افریقی مصاحف میں اسے بحذف الف "هرُوت" لکھا جاتا ہے مگر برصغیر' ایران' ترکی وغیرہ کے علاوہ لیبیا کے مصاحف میں اسے باثباتِ الف "هَارُوت" لکھا جاتا ہے۔

۶ "مَارُوت" : اس کی املاء میں بھی وہی مندرجہ بالا (هَارُوت والا) اختلاف ہے۔ یعنی ابوداؤد کے مطابق یہ "مٰرُوت" ہے۔ مگر الدانی کے مطابق اس کی املاء "مَارُوت" (باثباتِ الف) ہے۔

۷ "یُعَلِّمٰنِ" : یہ فعل مضارع کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے۔ عام رسم املائی میں اسے "یعلّمان" (باثبات الف بعد المیم) لکھا جاتا ہے۔ تثنیہ کے صیغے کے بارے میں رسم قرآنی کا قاعدہ یہ بیان کیا گیا ہے {۱} کہ تثنیہ کا الف (فعل میں ہو جیسے یہاں ہے یا کسی اسم مرفوع میں ہو جیسے "رَجُلَانِ" میں ہے) یہ جب لفظ کے اندر واقع ہو یعنی متطرف (آخر پر الگ) نہ ہو (جیسے قالا' کانَتا یا مضاف مرفوع مثلاً "رَسُولَا رَبِّکَ" میں ہے) تو ابوداؤد کے قول کے مطابق یہ الف تثنیہ ہر جگہ لکھا جاتا ہے البتہ بعض مقامات پر محذوف کیا جاتا ہے۔ جب کہ الدانی کے

{۱} دیکھئے' سمیر الطالبین' ص ۳۷ - المقنع ص ۱۷ - شرح العقیلہ' ص ۳۷ - و لطائف البیان لزیتحار ۱:۳۳ ونثر المرجان ۱:۳۱۔

مطابق تثنیہ کا یہ الف (اسماء و افعال دونوں میں) لکھنے میں محذوف ہوتا ہے البتہ سورۃ الرحمٰن کے "تُکَذِّبَانِ" دونوں طرح (بحذف اور باثبات) لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایشیائی ممالک اور لیبیا کے مصاحف میں یہ لفظ بحذفِ الف "یُعَلِّمٰنِ" لکھا جاتا ہے' جب کہ ابوداؤد کے قول پر عمل کرتے ہوئے بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے باثباتِ الف یعنی عام رسم املائی کی طرح "یُعَلِّمَانِ" لکھا جاتا ہے اور وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ اصل مصاحف عثمانی میں یہ (تثنیہ والے الفاظ) کہیں حذف الف اور کہیں اثبات الف کے ساتھ لکھے گئے تھے۔

۸ "اِشۡتَرٰیهُ" : اس کا ابتدائی صیغہ فعل "اِشۡتَرٰی" رسم املائی میں بھی آخر پر "ی" کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے جو پڑھی بصورت "الف" ہی جاتی ہے۔ جب اس صیغہ کے بعد کوئی ضمیر بطور مفعول آ رہی ہو (جیسے یہاں ہے) تو عام رسم املائی میں اس "ی" کو بصورتِ الف ہی لکھ دیتے ہیں (یعنی یہاں بصورت "اِشۡتَرَاهُ") تاہم قرآنِ کریم میں ایسی "ی" جو تعلیلِ صرفی کی بنا پر الف میں بدل کر بولی جاتی ہو عموماً اسے ہر جگہ بصورت "یاء" ہی لکھا جاتا ہے البتہ اس کے بعد مستثنیات ہیں جو حسب موقع بیان ہوں گے۔ تعلیلِ صرفی کے نتیجے میں الف میں بدلنے والی "یاء" کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے الف بصورت "یاء" ہی لکھے جاتے ہیں (مثلاً اِلٰی' علٰی' حتی یا یتامٰی' نحوی وغیرہ) جن میں سے بہت سے کلمات عام عربی میں بھی رسم قرآنی ہی کی طرح لکھے جاتے ہیں یعنی الف کو بصورت "ی" لکھنے کے کچھ مقررہ قواعد مستنبط کئے گئے ہیں اور ہر قاعدہ کے کچھ مستثنیات ہیں {۱} لہٰذا ہم ایسے الفاظ پر حسب موقع فرداً فرداً بات کرتے جائیں گے۔ بہرحال یہ لفظ "اشترٰی" (صیغہ واحد مذکر غائب) ضمیر مفعول برائے واحد مذکر (هُ) کے ساتھ قرآنِ کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ بالاتفاق الف بصورت یاء کے ساتھ (یعنی "اشترٰیه") ہی لکھا جاتا ہے۔

○ "الاٰخِرَۃ" : اس لفظ کے رسم عثمانی پر جو رسم املائی کے مطابق ہی ہے (یا یوں کہئے کہ رسم املائی دراصل قرآنی پر ہی مبنی ہے) اس سے پہلے البقرہ : ۴ [۲ : ۳ : ۳] میں مفصل بات ہوئی تھی۔

○ "خَلاق" : یہی اس کا رسم املائی بھی ہے۔ تاہم اس کے رسم عثمانی میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کے قول کے مطابق یہ "بحذف الالف بعد اللام" یعنی بصورت "خلٰق" لکھا

{۱} دیکھئے' المقنع ص ۶۳ ببعد' سمیر الطالبین' ص ۸۵ ببعد' نثر المرجان ۱:۶۹ ببعد

۲) "الشّیٰطِین": اس کی عام املاء "الشیاطین" (باثبات الف بعد الیاء) ہے مگر قرآنِ کریم میں بالاتفاق اسے یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ مفرد مرکب صورتوں میں ۱۸ جگہ آیا ہے) بحذف الالف بعد الیاء (الشیٰطین) لکھا جاتا ہے تاہم یہ الف پڑھا جاتا ہے اس لئے بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے اسی آیت میں یہ لفظ دوبار آیا ہے۔

۳) "سلیمٰن": اِس کی عام املاء "سُلَیمان" یعنی باثبات الف بعد المیم ہے مگر قران کریم میں اسے یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ کل ۱۷ جگہ آیا ہے دو دفعہ تو اسی آیت میں ہے) بالاتفاق بحذف الالف بعد المیم (بصورت "سلیمٰن") ہی لکھا جاتا ہے۔

۴) "لٰکِن": مخففہ (لٰکِنْ) ہو یا مشددہ (لٰکِنَّ) قرآن کریم میں بلکہ عام عربی املاء میں بھی ہمیشہ "بحذف الالف بعد اللام" لکھا جاتا ہے (قیاس تو "لاکِن" چاہتا تھا) اور اس کا یہ رسم املائی بھی عربی املاء پر رسم قرآنی (عثمانی) کے اثرات کا مظہر ہے۔

۵) "هَارُوت": یہ بھی ایک عجمی (غیر عربی) نام ہے۔ اس کے الف بعد الھاء کے حذف یا اثبات میں اختلاف ہے۔ ابوداؤد کی طرف منسوب قول حذف کے حق میں ہے جبکہ الدانی سے اثبات منقول ہے۔ چنانچہ بیشتر عرب اور افریقی مصاحف میں اسے بحذف الف "هروت" لکھا جاتا ہے مگر برصغیر، ایران، ترکی وغیرہ کے علاوہ لیبیا کے مصاحف میں اسے باثباتِ الف "هَارُوت" لکھا جاتا ہے۔

۶) "مَارُوت": اس کی املاء میں بھی وہی مندرجہ بالا (هَارُوت والا) اختلاف ہے۔ یعنی ابوداؤد کے مطابق یہ "مٰرُوت" ہے۔ مگر الدانی کے مطابق اس کی املاء "مَارُوت" (باثباتِ الف) ہے۔

۷) "يُعَلِّمٰنِ": یہ فعل مضارع کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے۔ عام رسم املائی میں اسے "یعلّمان" (باثبات الف بعد المیم) لکھا جاتا ہے۔ تثنیہ کے صیغے کے بارے میں رسم قرآنی کا قاعدہ یہ بیان کیا گیا ہے {۱} کہ تثنیہ کا الف (فعل میں ہو جیسے یہاں ہے یا کسی اسم مرفوع میں ہو جیسے "رَجُلَانِ" میں ہے) یہ جب لفظ کے اندر واقع ہو یعنی متطرف (آخر پر الگ) نہ ہو (جیسے قالا، کانتا یا مضاف مرفوع مثلاً "رَسُولَا رَبِّكَ" میں ہے) تو ابوداؤد کے قول کے مطابق یہ الف تثنیہ ہر جگہ لکھا جاتا ہے البتہ بعض مقامات پر محذوف کیا جاتا ہے۔ جب کہ الدانی کے

{۱} دیکھئے، سمیر الطالبین، ص ۳۷ - المقنع ص ۱۷ - شرح العقیلہ، ص ۴۷ - و لطائف البیان لزیتحار ۱: ۳۳ و نثر المرجان ۱: ۳۱۔

مطابق تثنیہ کا یہ الف (اسماء و افعال دونوں میں) لکھنے میں محذوف ہوتا ہے البتہ سورۂ الرحمٰن کے "تُکَذِّبَانِ" دونوں طرح (بحذف اور باثبات) لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایشیائی ممالک اور لیبیا کے مصاحف میں یہ لفظ بحذفِ الف "یُعَلِّمٰنِ" لکھا جاتا ہے' جب کہ ابو داؤد کے قول پر عمل کرتے ہوئے بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اسے باثباتِ الف یعنی عام رسم املائی کی طرح "یُعَلِّمَانِ" لکھا جاتا ہے اور وجہ اس اختلاف کی یہ ہے کہ اصل مصاحف عثمانی میں یہ (تثنیہ والے الفاظ) کہیں حذف الف اور کہیں اثبات الف کے ساتھ لکھے گئے تھے۔

⑧ "اِشْتَرٰیهُ": اس کا ابتدائی صیغہ فعل "اِشْتَرٰی" رسم املائی میں بھی آخر پر "ی" کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے جو پڑھی بصورت "الف" ہی جاتی ہے۔ جب اس صیغہ کے بعد کوئی ضمیر بطور مفعول آ رہی ہو (جیسے یہاں ہے) تو عام رسم املائی میں اس "ی" کو بصورتِ الف ہی لکھ دیتے ہیں (یعنی یہاں بصورت "اِشْتَرَاهُ") تاہم قرآنِ کریم میں ایسی "ی" جو تعلیلِ صرفی کی بنا پر الف میں بدل کر بولی جاتی ہو عموماً اسے ہر جگہ بصورت "یاء" ہی لکھا جاتا ہے البتہ اس کے بعد مستثنیات ہیں جو حسب موقع بیان ہوں گے۔ تعلیلِ صرفی کے نتیجے میں الف میں بدلنے والی "یاء" کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے الف بصورت "یاء" ہی لکھے جاتے ہیں (مثلاً اِلٰی' علٰی' حتی یا یتامٰی' نحوی وغیرہ) جن میں سے بہت سے کلمات عام عربی میں بھی رسم قرآنی ہی کی طرح لکھے جاتے ہیں یعنی الف کو بصورت "ی" لکھنے کے کچھ مقررہ قواعد مستنبط کیے گئے ہیں اور ہر قاعدہ کے کچھ مستثنیات ہیں {۱} لہٰذا ہم ایسے الفاظ پر حسب موقع فرداً فرداً بات کرتے جائیں گے۔ بہرحال یہ لفظ "اشتریٰ" (صیغہ واحد مذکر غائب) ضمیر مفعول برائے واحد مذکر (ہٗ) کے ساتھ قرآنِ کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے اور دونوں جگہ بالاتفاق الف بصورت یاء کے ساتھ (یعنی "اشترٰیہ") ہی لکھا جاتا ہے۔

○ "الاٰخِرَة": اس لفظ کے رسم عثمانی پر جو رسم املائی کے مطابق ہی ہے (یا یوں کہئے کہ رسم املائی دراصل قرآنی پر ہی مبنی ہے) اس سے پہلے البقرہ: ۴ [۲: ۳: ۳] میں مفصل بات ہوئی تھی۔

○ "خَلَاق": یہی اس کا رسم املائی بھی ہے۔ تاہم اس کے رسم عثمانی میں اختلاف ہے۔ ابو داؤد کے قول کے مطابق یہ "بحذف الالف بعد اللام" یعنی بصورت "خلٰق" لکھا

{۱} دیکھئے' المقنع ص ۶۳ ببعد' سمیر الطالبین' ص ۸۵ ببعد' نثر المرجان ۱: ۶۹ ببعد

جاتا ہے۔ الدانی نے اس کے حذفِ الف کا ذکر نہیں کیا جو اثبات کو مستلزم ہے۔ بلکہ الدانی نے "فعّال" کے وزن پر آنے والے کلمات میں الف کے اثبات کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ یہ لفظ بھی بیشتر افریقی و عرب ممالک کے مصاحف میں بحذف الف (خَلٰق) لکھا جاتا ہے۔ اور لیبیا کے علاوہ تمام ایشیائی ممالک میں یہ باثبات الف (خَلَاق) لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآنِ کریم میں (مفرد یا مرکب شکل میں) کل چھ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ یہی اختلاف ہے۔

○ "لَبِئْسَ مَا" : یہ دو لفظ یہاں بالاتفاق مقطوع لکھے جاتے ہیں یعنی "لبئس" کے "س" کو "ما" کے ساتھ ملا کر نہیں لکھا جاتا ہے (جیسا کہ چند مقررہ مقامات پر "بئس" اور "ما" کو موصول (ملا کر) لکھا جاتا ہے۔ مزید دیکھئے البقرہ : ۹ [۲ : ۵۵ : ۳] میں کلمہ "بِئْسَمَا" کی بحث الرسم۔

۲ : ۶۲ : ۴ الضبط

زیرِ مطالعہ قطعہ میں ضبط کا کافی تنوع موجود ہے۔ تاہم اب ہم صرف ان کلمات کے ضبط کے نمونے دیں گے جن میں تنوع زیادہ ہے۔ اگر محض حرکات یا ہمزہ کی شکل کا فرق ہے (ـَـ ، ـِـ ، ـُـ یا ـًـ ، ـٍـ ، ـٌـ ، یاء ، 'E' ، ریا وغیرہ) تو اسے دوبارہ نہیں لکھا جائے گا: مثلاً

وَاتَّبَعُوا، وَٱتَّبَعُوا، وَاتَّبَعُوْا / مَا / تَتْلُوْا، تَتْلُواْ، تَتْلُواْ / الشَّيٰطِيْنُ، الشَّيٰطِينُ، ٱلشَّيَٰطِينُ، اَلشَّيٰطِيْنُ / عَلٰى، عَلَىٰ / مُلْكِ / سُلَيْمٰنَ، سُلَيْمَٰنَ، سُلَيْمٰنَ / وَمَاكَفَرَسُلَيْمٰنُ / وَلٰكِنَّ، لَٰكِنَّ، لٰكِنَّ / الشَّيٰطِيْنَ / كَفَرُوْا، كَفَرُواْ، كَفَرُوا / يُعَلِّمُوْنَ، يُعَلِّمُونَ، يُعَلِّمُوْنَ / النَّاسَ، ٱلنَّاسَ، اَلنَّاسَ / السِّحْرَ، ٱلسِّحْرَ، اَلسِّحْرَ / وَمَا / اُنْزِلَ، أُنزِلَ / عَلَى الْمَلَكَيْنِ، ٱلْمَلَكَيْنِ / بِبَابِلَ / هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، هٰرُوتَ وَمٰرُوتَ (بحذف الالف) / وَمَا / يُعَلِّمٰنِ، يُعَلِّمَٰنِ، يُعَلِّمَانِ / مِنْ، مِنْ / اَحَدٍ، أَحَدٍ / حَتّٰى، حَتَّىٰ / يَقُوْلَا، يَقُولَا، يَقُولَآ / اِنَّمَا، إِنَّمَا / نَحْنُ، نَحْنُ / فِتْنَةٌ، فِتْنَةٌ / فَلَاتَكْفُرْ، فَلَا تَكْفُرْ / فَيَتَعَلَّمُوْنَ، فَيَتَعَلَّمُونَ / مَا / يُفَرِّقُوْنَ، يُفَرِّقُونَ، يُفَرِّقُونَ / بِهٖ، بِهِۦ، بِهٖ / بَيْنَ، بَيْنَ / الْمَرْءِ، ٱلْمَرْءِ، اَلْمَرْءِ / وَزَوْجِهٖ، وَزَوْجِهِۦ / وَمَاهُمْ / بِضَآرِّيْنَ، بِضَآرِّينَ، بِضَارِّيْنَ / بِهٖ / مِنْ اَحَدٍ / اِلَّا،

(باقی صفحہ ۱۴۱ پر)

وقت کے نہایت اہم' انتہائی نازک اور حساس موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وقیع تالیف

شیعہ سنی مفاہمت

کی ضرورت و اہمیت

شائع ہو گئی ہے۔ جس میں مذکورہ بالا موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کے فکر انگیز خطاب کے ساتھ ساتھ درج ذیل موضوعات پر مضامین بھی شامل ہیں :

i) حضرت مہدی موعود کی شخصیت کے بارے میں اہل سنت و اہل تشیع کا موقف (از : ڈاکٹر اسرار احمد)

ii) امیر تنظیم اسلامی کے سفر ایران کے مشاہدات و تاثرات

iii) اسلام میں مختلف مسالک کی حیثیت اور مفاہمت کا راستہ (خطاب : آیت اللہ محمد واعظ زادہ خراسانی)

خود بھی مطالعہ کیجئے اور اپنے حلقہ احباب میں بھی عام کیجئے!

صفحات ۱۳۴' سفید کاغذ' عمدہ طباعت' قیمت ۴۰ روپے

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن فون : 5869501